بیگم سمرو

میرٹھ کی اردو بولنے والی لڑکی جو یورپین طرز کی فوج کی کمانڈر اور
بڑی جاگیر کی مالک بن گئی

رضا علی عابدی

بیگم سمرو

میرٹھ کی اردو بولنے والی لڑکی جو یورپین
طرز کی فوج کی کمانڈر اور بڑی جاگیر کی
مالک بن گئی

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Abdi , Raza Ali
Begum Samru / Raza Ali Abdi.-
Lahore: Sang-e-Meel Publications,
2023.
78pp + 20 Pictures.
1. Urdu Literature - History.
I. Title.

2023ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3535-9
ISBN-13: 978-969-35-3535-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پہلے یوں ہوا!

میرٹھ شہر کے قریب مسلمانوں کا ایک قصبہ ہے 'کتانہ'۔ وہی میرٹھ جہاں سے انگریزوں کی حکمرانی کے خلاف دس مئی اٹھارہ سوستاون کو تاریخی بغاوت کا پہلا شعلہ بھڑکا تھا اور وہی کتانہ جس کے بارے میں مقامی باشندے بتاتے ہیں کہ وہاں قاضی خاندان آباد تھا۔ اسی گھرانے کے ایک سرکردہ زمیندار لطف علی خاں تھے جن کا شمار شرفاء میں ہوتا تھا۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا اور دوسری بیوی سے ایک بیٹی تھی جس کا نام فرزانہ تھا۔ پھر وہی ہوا جو اس قسم کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ لطف علی خاں چل بسے۔ ان کے مرنے کی دیر تھی کہ ان کے بیٹے نے ان کی دوسری بیوی پر ظلم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیئے۔ وہ خوب صورت تھی اور دلّی جیسے شہر سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ اس کی کمسن بیٹی اس سے بھی زیادہ دلکش تھی اور اس کی رنگت کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کشمیری سیب جیسی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کشمیری تھی لیکن کچھ کو یقین تھا کہ وہ

سیدانی تھی۔ جو بھی تھا، بیٹے کو فرزانہ اور اس کی ماں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس کی زیادتیاں اتنی بڑھیں کہ ایک روز ماں نے دس برس کی بیٹی فرزانہ کی انگلی پکڑی اور گھر سے نکل گئی۔ وہ ایک ہی شہر سے اور اس کے ایک ہی علاقے سے واقف تھی جہاں وہ شروع کی زندگی گزار چکی تھی، اور وہ تھا دلّی شہر کا بازار حسن۔

دس دن کا سفر طے کر کے یہ دونوں دلّی کے کشمیری دروازے تک پہنچیں۔ وہیں جہاں حملہ آور فوجوں کو روک دیا جاتا تھا۔ ماں کئی روز سے بخار میں مبتلا تھی، دلّی کے قریب پہنچ کر وہ ہار مان گئی اور غش کھا کر گر پڑی۔ اس کے سرہانے بیٹھی بیٹی کی سسکیاں سن کر قریب سے گزرتی ہوئی ایک پالکی رُکی۔ اس میں بیٹھی ہوئی خاتون ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لڑکی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی خاتون نے دونوں کو پناہ دینے کا اعلان کر دیا۔ وہ خاتون بازار حسن کی طوائف تھیں اور ایک ہی نگاہ میں بھانپ گئیں کہ یہ بچی بڑے کام کی ہے۔ ذرا دیر بعد وہ کوٹھے پر پہنچ گئیں اور انہیں پناہ ملنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگے۔ جہاں دیدہ خاتون نے ٹھان لی کہ ذرا سی تربیت سے لڑکی اپنی ماں کی جگہ لے لے گی۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ فرزانہ جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی اور

سب دیکھ سکتے تھے کہ اس پر بلا کا روپ آ رہا ہے۔اس کی آنکھوں میں نہ صرف چمک تھی بلکہ ان سے ذہانت بھی ٹپکتی تھی۔اس کی جلد کی رنگت سیپ سے نکلے تازہ موتی جیسی تھی۔رہی سہی کسر اس کے بوٹا سے قد نے پوری کر دی تھی۔یہ قد اس کے روپ رنگ پر خوب پھبتا تھا۔لڑکی کی تربیت شروع ہوئی اور جلد ہی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔

یہ بات سنہ 1760ء کی ہے۔دلّی پر برا وقت پڑا تھا۔کل کیا ہوگا، کسی کو معلوم نہ تھا۔احمد شاہ ابدالی کے حملے کے زخم ابھی تازہ تھے۔پانی پت کی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔فرزانہ کو ماں کی ہدایت یاد تھی کہ گھر سے زیادہ دور نہ جانا، باہر زمانہ خراب ہے، لوگوں سے ہوشیار رہنا، بس جامع مسجد سے آگے نہ جانا اور لال قلعے میں پاؤں نہ رکھنا کہ یہ وقت کسی کا نہیں۔مگر قدرت نے یہ پاؤں شاید کتھک کے لئے تراشے تھے۔طبلے کی تھاپ پر فرزانہ کے پاؤں ماہر رقاصاؤں کی طرح تھرکنے لگے۔

دلّی کے تخت پر شاہ عالم نئے نئے بیٹھے تھے۔وہ خود تو دور کہیں بہار میں تھے، یہاں شہر میں مغل امراء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ان ہی دنوں دھوم مچی کہ ایک فرنگی فوجی شہر میں آیا ہے اور یہیں کہیں دیکھا گیا ہے۔وہی ہوا، گورا جرنیل فرزانہ کی محفل

میں نمودار ہوا تو خانم جان نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایسی پذیرائی کی کہ وہ اسی محفل کا ہو رہا۔ سارے علاقے کو خبر ہو گئی کہ جنرل رائین ہارٹ، جنہیں دنیا سمرو صاحب کے نام سے جانتی ہے، یہیں دل لگا بیٹھے ہیں۔ خانم جان نے ان کے لئے اپنی نئی نویلی رقاصہ کی محفل سجائی، جو خوب سجی۔

فرزانہ کیا جانے کہ گورے صاحب اور خانم جان میں کیا مشورے ہوئے ہیں اور آہستہ سے جو تھیلی خانم کے حوالے کی گئی ہے اس میں کون سے اور کتنے سکّے بھرے ہیں۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ اس کو یہ نیا بسا بسایا کوٹھا چھوڑ کر سمرو صاحب کے حرم میں جانا ہوگا اور یہ تو اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ مقدر اس کے ساتھ کیسی عجب کارستانیاں کرنے چلا ہے۔ ابھی اسے خبر نہ تھی کہ یہ یورپ سے آیا ہوا شخص، جس میں دل کشی نام کو نہ تھی، بدن بھی ستواں نہیں تھا، بال کھچڑی ہو چلے تھے، اردو اور فارسی بولتا تھا، کرائے کا فوجی تھا۔ دوسروں کے لئے جنگ کرتا تھا اور زندگی کے اس مرحلے پر لڑ لڑ کر تھک چکا تھا۔ اس کی کمان کے نیچے چار بٹالین فوج تھی اور تھوڑی بہت توپیں تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے حرم سے ایسا راستہ نکلتا تھا جو لامتناہی ہے اور جس کی منزلیں بے شمار ہیں۔ وہ کوٹھے سے اتر کر سفید فام فوجی کی دسترس میں جا تو رہی ہے لیکن کیا عجب کچھ ایسا ہو

جائے کہ وہ واپس بھیج دی جائے۔ اس روز اس کے اندر کی ذہانت بولی، نہیں، یوں نہیں ہونے دوں گی۔

جس روز اسے لے جانے کے لئے سجی دھجی پالکی دروازے پر لگی، اس نے طے کیا کہ کتانہ میں گزرے ہوئے کڑے وقتوں اور شدید آزمائشوں کو وہ وہیں کہیں دلّی کی کسی گلی کے پچھواڑے چھوڑ جائے گی۔ یہی ہوا، پھر اس نے کبھی زبان نہیں کھولی۔

وقت آگے بڑھتا گیا۔ وہ فرزانہ سے بیگم سمرو ہو گئی۔ تیرہ سال بعد سمرو صاحب چل بسے تو ایک بحران نے سر اٹھایا۔ اس نے فوراً ہی اپنی جانشینی کا دعویٰ کر دیا اور گنگا اور جمنا کے درمیان اس علاقے پر اپنا حق جتانے لگی جو سمرو نے جنگیں جیت کا انعام میں پایا تھا۔ بادشاہ شاہ عالم نے بیگم کو نہ صرف یہ علاقہ عطا کیا بلکہ زیب النساء کا خطاب بھی دیا۔ کیوں نہ دیتا کہ اس نے کبھی بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بادشاہ کی جان بچائی تھی۔ اسی پر بس نہیں، اس کی دوست اور اتحادی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کو ہر ہائی نس بیگم سمرو آف سردھنا قرار دیا۔ ان نوازشوں اور عنایتوں نے اسی سردھنا سے ذرا فاصلے پر کتانہ نامی قصبے سے اٹھا کر اس ساڑھے چار فٹ کی عورت کا قد کتنا بڑا کر دیا۔ یہ داستان مقدر کی ان ہی کرامات کو

بیان کرنے چلی ہے۔

ہندوستان پر برا وقت پڑا۔ بابر سے اورنگ زیب تک سارے نمٹ گئے۔ مختلف علاقوں اور ریاستوں میں پرانی حکمرانیاں کمزور پڑنے لگیں۔ خود کو مضبوط بنانے کے لئے انہیں توانائی کہاں سے ملی، سفید فام غیر ملکیوں سے۔ مغل بادشاہت کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگی۔ تمام ریاستیں خود مختار ہونے لگیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سارے نظام پر سمندر پار سے آئے ہوئے لوگ حاوی آنے لگے۔ مگر ان لوگوں کے درمیان بالادستی کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ فرانس والوں کا پلہ بھاری تھا مگر انگریز بھی خاموشی سے موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ آخری غضب یوں ہوا کہ شمال کی جانب سے ہندوستان پر دو بڑے حملے ہوئے۔ پہلے نادر شاہ تلوار سونت کر چڑھ دوڑا (1739ء)، اس نے دلّی کو اچھی طرح لوٹا اور آخر تخت طاؤس لے کر چلتا بنا۔ اس کے نتیجے میں مغل بادشاہت ادھ موئی ہوگئی۔ بیس بائیس سال بعد افغانستان کے احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی کمر توڑ دی۔ ان واقعات کے بعد ہندوستانیوں کے دوبارہ ابھرنے کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور بالآخر غیر ملکیوں کی بالادستی کی راہ ہموار ہونے لگی۔

مغل امراء نے ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھالیں اور سچ تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کی موت (1707ء) کے ساتھ ہی یہ شیرازہ بکھرنے لگا۔ کہاں چھ شاہنشاہوں نے ہندوستان کے تخت پر دو صدیاں گزاریں، کہاں اگلی آدھی صدی میں اس تخت پر کم سے کم دس شہزادے کٹھ پتلی بن کر بیٹھے اور حکمرانی مذاق بن کر رہ گئی۔ بہادر شاہ کے چار بیٹوں میں سے ایک کے بارے میں مشہور تھا کہ ہر وقت ہاتھوں میں آئینہ اور کنگھی سنبھالے اپنی زلفیں سنوارا کرتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ یہ شاہزادے مرتے جاتے تھے اور جھٹ ہمایوں کے مقبرے میں یوں گاڑ دیئے جاتے تھے کہ نہ کسی کی قبر کا رخ درست ہے اور نہ کسی مدفن پر کسی کا نام پتہ لکھا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ نام کے بادشاہ تھے اور فرمانوں پر ان کی مہریں لگا کرتی تھیں۔ اور تو اور انگریز بھی مغل شہنشاہ کی منظوری لینے پر مجبور تھے۔ مگر دلّی پر لارڈ لیک کے قبضے (1803ء) کے بعد یہ رعایت بھی جاتی رہی اور شاہ عالم اور ان کے دو جانشینوں کو سفید فام آقاؤں نے ''دلّی کے بادشاہ'' کا خطاب دے کر انہیں ایک کونے میں بٹھا دیا۔ حکمرائیٔ شاہ عالم، از دلّی تا پالم زبان زد عام ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی حاکمیت کے معاملے میں محتاط رہی اور اسی طرح بیگم سمرو نے بھی بادشاہ کو بادشاہ مانا اور

وفاداری نبھاتی رہی۔ مغل امراء بادشاہ کی کمزوری سے کتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہوں، اس کے انعام واکرام کے لئے اس کی سند حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ مغل حکمرانی کو جتنا نقصان امراء کی آپس کی کھینچا تانی نے پہنچایا، دوسروں نے اتنی زک نہیں پہنچائی۔ آخر مرہٹوں کی دوسری جنگ (1803-1805) کے نتیجے میں برطانوی بالا دستی قائم ہو گئی۔

اس دوران سکھ، مرہٹے، راجپوت اور پٹھان زیادہ سے زیادہ علاقہ گھیرنے کے ارادے باندھتے رہے۔ دلّی کے تخت پر ہر ایک کی نظر تھی مگر وسائل کی کمی مار گئی اور روہیلوں کو تو انگریزوں نے دبوچ لیا۔ سکھ دلّی کے نواح تک منڈلاتے رہے مگر ہر بار یہی خبر ملی کہ دلّی ابھی دور ہے۔ ان کے سرگرم ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ افغانوں کی راہ میں دیوار بن گئے ورنہ افغان ادھر کا پھیرا کر چکے تھے اور ان کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔

مختصر یہ کہ ہر ایک ہر ایک سے لڑ رہا تھا۔ ہر طرف جنگیں جاری تھیں لیکن وہی پرانے ہتھیار تھے اور وہی دقیانوسی جنگی چالیں تھیں کہ اسی دوران دھوم مچی۔ دھوم یہ مچی کہ یہ گورے لوگ کمال کے سپاہی ہوتے

ہیں، خود بھی لڑنا جانتے ہیں اور اپنی فوجیں کھڑی کر کے ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے ڈھب کی تربیت دیتے ہیں، ان کے ہتھیار بھی نئے ہیں اور جنگی چالیں خدا جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

یہاں یہ دھوم مچی۔ ایک دھوپ یورپ میں بھی مچ گئی۔ وہ یہ کہ ہندوستان میں دولت کی افراط ہے۔ راجا مہاراجا سونے چاندی کے انبار پر بیٹھے ہیں مگر ان کی فوجیں ناکارہ ہیں۔ وہ یورپ والوں کو خرید رہے ہیں اور سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور مسلمانوں کو بھی کرائے کے فوجی درکار ہیں جو آئیں، ان کی تازہ دم فوجیں کھڑی کریں، یورپ کی طرز کی پریڈیں کرائیں اور لڑنے بھڑنے کی اپنے انداز کی تربیت کریں۔ پھر ہوا یہ کہ صرف یہ شہرت ہی نہیں ہوئی، ہم اپنے سمر صاحب کو جانتے ہیں جو تاریخ میں جنرل سومبر کے نام سے مشہور ہیں۔ اس شخص کا اصل نام والٹر رائین ہارٹ تھا، سالزبرگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ قصائی تھا۔ یہ خوبی کچھ عرصہ بعد اس کے کام بھی آنے والی ہے۔ جوان ہو کر یہ فرانس کی فوج میں بھرتی ہوا۔ اس کے بعد بحریہ میں چلا گیا اور ہندوستان جانے والے کسی سمندری جہاز پر چڑھ کر پانڈیچری جا پہنچا۔ یہ بات سنہ 1750ء کی ہے۔ اسی سال وارن شنگز بھی کلکتہ پہنچا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں فرانس

والوں کا پلہ بھاری تھا اور فرانسیسی کمپنی چھائی ہوئی تھی۔ سمرو کی حیثیت عام سپاہی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں بھی مقبول نہ تھا۔ خاموش خاموش سا رہتا اور ہر وقت افسردگی طاری رہتی۔ اسی بنا پر اس کا نام سومبر Sombre پڑ گیا جسے ہندوستانی فوجیوں نے سمرو بنا دیا۔ نام کے ساتھ اس کی تاثیر بھی بدل گئی۔ سمرو نے ہندوستانی وضع قطع اختیار کر لی۔ اس کا پہناوا، اس کا اٹھنا بیٹھنا ہندوستانی ہو گیا اور وہ اردو اور فارسی روانی سے بولنے لگا۔

فرانس کی فوج کو چھوڑ کر وہ بنگال چلا گیا اور وہاں گھومتا رہا۔ آخر بنگال کے نواب میر قاسم کی فوج میں شامل ہو گیا۔ یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ میر قاسم کا چہیتا ہو گیا۔ مگر اس چاہت نے اس کے دامن پر ایسا داغ لگایا جو کبھی دھل نہ سکا۔ میر قاسم برا آدمی نہ تھا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں نے اس کے ساتھ کچھ ایسا رویہ رکھا کہ وہ برہم ہو گیا اور اس نے انگریزوں سے نجات پانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان ہی دنوں فیکٹری کے سربراہ مسٹر ایلس اور کچھ دوسرے یورپی باشندوں نے اس کے شہر پٹنہ پر حملہ کیا اور سارے کے سارے پکڑے گئے۔ میر قاسم نے سب کو گولی مار دینے کا حکم دے دیا۔ اس کے

ہندوستانی فوجیوں نے قتل عام سے انکار کر دیا، آخر سمرو نے اس حکم کی تعمیل کی اور 5 اکتوبر 1703ء کو اس نے اکیاون قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک سال بعد بکسر کی لڑائی ہوئی جس میں انگریز جیت گئے اور اودھ اور بنگال کے نواب ہارے۔ اس دوران سمرو نے اپنی فوج کھڑی کر لی جس کے افسر یوروپین تھے۔ اب وہ روزگار کی تلاش میں گھومتا رہا اور آخر بھرت پور کے جاٹ حکمراں جواہر سنگھ کا ملازم ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جواہر مر گیا اور جاٹوں کی حکمرانی انتشار کا شکار ہو گئی۔ اس پر دلّی کے بادشاہ کے اعلیٰ وزیر، امیر الامراء نجف خاں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاٹوں پر چڑھائی کر دی۔ جاٹوں کی فوج معمولی نہ تھی۔ اس کی کمان سمرو اور کچھ فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ زور کی لڑائی ہوئی جس کے آخر میں اگرچہ جاٹ ہار گئے مگر سمرو کی فوجی قابلیت تسلیم کر لی گئی اور کہا گیا کہ یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ اس پر نجف خان نے سمرو کو اپنے ساتھ ملانا چاہا اور اسے تیس ہزار روپے ماہانہ کی پیش کش کی۔ جاٹوں کی ملازمت میں اب یوں بھی کوئی کشش نہ رہی تھی، سمرو نے نجف خان کے سارے خط بادشاہ کے حوالے کر دیئے اور معافی کا طلب گار ہوا۔

شاہ عالم بے چارہ نحیف ونزار بادشاہ اپنے نائب وزیر عبدالاحد خان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے سمرو کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے چال چلی۔ عبدالاحد خان نے بادشاہ سے کہا کہ سکھوں کی شرارتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور انہوں نے دلّی کی دہلیز پر شاہدرہ تک کا علاقہ لوٹ کر اس میں آگ لگا دی ہے۔ سکھوں کو ان کے کئے کی سزا دینے کے لئے اور سمرو کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اسے معاف کر کے شاہی ملازمت میں قبول کر لیجئے۔ بادشاہ مان گیا اور سمرو کو لال قلعے میں طلب کر لیا گیا۔ اسے اکیس مئی 1774ء کو نہایت شان وشوکت سے شرف بازیابی بخشا گیا، اس موقع پر توپوں کی سلامی دی گئی اور بڑی ہی پذیرائی ہوئی۔

اب سمرو کو حکم دیا گیا کہ وہ سکھوں پر چڑھائی کرے اور انہوں نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا وہ سارے علاقے چھڑائے جائیں۔ سمرو کو پیش کش کی گئی کہ اسے تنخواہ کی بجائے پانی پت اور سونی پت کے علاقوں کی سند دی جائے گی اور کرنال کے سکھوں سے وہ جتنا علاقہ چھین سکتا ہے وہ بھی اُسی کا ہوگا۔ سمرو کے پاس اُس وقت پانچ نئی توپیں، کافی مقدار میں گولہ بارود، دو ہزار سے کچھ کم سپاہی، کچھ یورپین اور چھ ہاتھی تھے۔

ادھر نجف خاں جاٹوں کے خلاف مسلسل لڑے جا رہا تھا، اس کو

جنرل سمرو کی سخت ضرورت تھی کیونکہ سمرو جاٹوں کے علاقے سے اور دربار سے خوب واقف تھا۔ نجف خاں نے سمرو کو خفیہ خط لکھے اور بڑی بڑی پیشکشیں کیں۔ سمرو بھی معاملے کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے عبدالاحد خاں کو لکھا کہ یہ جو دو پرگنے مجھے دیئے گئے ہیں، یہ ناکافی ہیں۔ اسے پانی پت سے پانچ ہزار روپئے اور سمبھلکا سے تین ہزار روپے کی آمدنی ہے جو وہ ساری میری فوج پر اٹھ جاتی ہے اور مجھے اوپر سے خود خرچ کرنا پڑتا ہے۔ سمرو نے اس طرح کے دس پندرہ خط لکھے اور اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لئے زیادہ علاقے طلب کئے۔ مگر کسی پر اس کی درخواستوں کا اثر نہ ہوا۔ تھک ہار کر اس نے کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر نجف خاں جاٹوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور اسے کامیابیاں بھی ہو رہی تھیں۔ دلّی کے دربار میں اس کا مقام بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ سمرو کو جاگیر عطا کر دی جائے تاکہ اس کا اور اس کی فوج کا گزارا ہو سکے۔ بادشاہ مان گیا۔

ادھر انگریز اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ سمرو کو باغی قرار دے کر بادشاہ کی پناہ سے نکال دیا جائے لیکن جنرل سمرو کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے انگریزوں کی ہر چال ناکام بنا دی۔ بادشاہ نے بھی دیکھا کہ

انگریزوں کی خفگی سے زیادہ سمرو کی وفاداری سود مند ہے۔لٰہذا شاہی فرمان جاری ہوااور سمرو کی گزربسر کے لئے اسے شاہی جاگیر عطا کردی گئی۔ یہ گنگا اور جمنا کے درمیان سرسبز اور کشادہ علاقہ تھا جو علی گڑھ سے لے کر مظفر نگر سے آگے تک پھیلا ہوا تھا اور جس کی سالانہ آمدنی چھ لاکھ روپئے تھی۔ سمرو نے اس علاقے کے درمیان ایک گاؤں کو اپنا گھر بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس گاؤں کا نام سردھنا تھا۔

لیکن اس کے بعد وہ زیادہ نہیں جیا۔ اسے گورنر بنا کر آگرہ بھیجا گیا جہاں اسے ٹھنڈ لگی، بداحتیاطی ہوئی، اسے نمونیا ہوا اور وہ چار مئی 1778ء کو اٹھاون سال کی عمر میں چل بسا۔ اسے پہلے اس کے باغ میں دفن کیا گیا، تین سال بعد اس کی باقیات آگرہ کے چرچ میں دفن کی گئیں اور یہ فرض اس کی بیوہ بیگم سمرو نے سرانجام دیا جو اس وقت مسیحی ہو چکی تھی۔ خود سمرو نے وہ مسیحی رسمیں ادا نہیں کیں جو آخر وقت میں کی جاتی ہیں۔ نہ اس نے پادری کو بلایا اور نہ اعتراف گناہ کئے۔ یہ تو چرچ نے اس کے ساتھ بڑی رعایت کی کہ اپنے ہاں دفن ہونے دیا۔ اس موقع پر سرکردہ مورخ لیسٹر ہچن سن نے لکھا ہے کہ ''اگر سمرو کا کسی مذہب کی طرف ذرا سا بھی جھکاؤ تھا تو دین اسلام تھا۔''

انگریزوں کو اس کی موت پر بڑا قلق رہا۔ انہیں یہ دکھ تھا کہ پٹنہ کے قیدیوں کا قاتل انتقام کے بغیر ہی نکل گیا۔

جنرل سمرو ان دنوں جاٹ راجا جواہر سنگھ کا ملازم تھا اور اس کی خدمت کرتے ہوئے دلّی کے ناکام محاصر میں شامل تھا (1765ء)۔ وہی دن تھے جب ایک بڑی ہی روپ رنگ والی لڑکی اس کی نظروں میں آئی، اتنی کہ مسلمان لڑکی اور مسیحی لڑکے کی شادی کی جو بھی رسمیں ہو سکتی ہیں، وہ ادا کی گئیں اور فرزانہ نام کی وہ ضلع میرٹھ کی لڑکی بیگم سمرو بن گئی۔ اس کے والد قصبہ کتانہ کے لطف علی خاں تھے، جنہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ فرزانہ ان کی دوسری بیوی سے تھی۔ وہ ابھی کم سن تھی کہ لطف علی خاں مر گئے۔ اس کے بعد پہلی بیوی کے بیٹے نے سوتیلی ماں اور بہن پر ظلم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے۔ باپ کی موت اور سوتیلے بھائی کی زیادتیاں دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ فرزانہ نے اپنی نوعمری میں بہت دکھ کے دن دیکھے۔ تنگ آ کر ماں نے ایک روز بیٹی کا ہاتھ تھاما اور یہ دونوں گھر سے نکل کر دلّی جا پہنچیں۔ اسی دوران فرزانہ پر جوانی کا نکھار آ رہا تھا کہ یورپین فوجی سے اس کا آمنا سامنا ہوا اور فوجی بھی ایسا کہ اگرچہ اس کے حرم میں ایک مسلمان خاتون موجود تھیں، وہ

اس بوٹا سے قد والی حسینہ کو دل دے بیٹھا۔ ایک روز سجا دھجا ڈولا آیا اور لڑکی اپنے نئے گھر کو سدھاری۔ ایک تو خوش شکل اوپر سے بلا کی ذہین، جنرل سمرو اس کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی اس قدر کہ اس نے سوچا کہ بہت لڑائیاں لڑ چکا، بس اب سکھ چین کی زندگی گزاری جائے۔ بیگم سمرو نے بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور رفتہ رفتہ سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب بادشاہ نے سمرو کو جاگیر دینے کا فیصلہ کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے لئے کوئی علاقہ چن لے تو پس منظر میں بیگم سرگرم ہوئی اور چونکہ اس بے حد مال دار علاقے سے واقف تھی، اسی کے کہنے سردھنا کی جاگیر عطا ہوئی۔

مگر یہ سکھ چین کے دن زیادہ عرصہ نہیں چلے اور جنرل سمرو مر گئے۔ ان کی پہلی بیٹی سے ایک بیٹا تھا جسے بیگم کی سفارش پر بادشاہ نے ظفریاب خان کا خطاب دیا تھا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر کچھ کمزور تھا اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جانے لگا کہ وہ اپنے باپ کا جانشین نہ ہو سکے گا۔ اس مرحلے پر بیگم سمرو سے کہا گیا کہ وہ سمرو کی فوج کی کمان سنبھالے اور اس میں شامل سارے یورپین اور ہندوستانی اس کے حکم پر چلیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ سب منظّم رہیں اور انتشار نہ پیدا ہو۔ بیگم مان گئی اور بادشاہ شاہ عالم

نے اپنے ہاتھوں اسے کمانڈر مقرر کیا۔ اب وہ تھی، اس کی اپنی فوج تھی اور اسی کی حکمرانی تھی۔

اور یہ سب یوں ہی نہیں تھا۔ بادشاہ نے اس پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا وہ بلا سبب نہ تھا۔ وہ غضب کی جری، شجاعت کا پیکر اور جنگ وجدل کی عادی تھی کیونکہ اپنے شوہر کے شانہ بشانہ وہ کتنے ہی معرکے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ جس وقت اس نے فوج کی کمان سنبھالی، اس کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ایک جرمن تھا جس کا نام پاوَلی تھا۔

شوہر کی وفات کے تین سال بعد بیگم اور اس کا سوتیلا بیٹا ظفریاب آگرہ کے چرچ میں مذہب تبدیل کر کے مسیحی ہو گئے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فوج کے یورپین افسروں کے اصرار پر ہوا ہوگا۔ اس وقت بیگم کو جوآنا Joanna کا نام دیا گیا اور بیٹا لوئی رائین ہارٹ کہلایا۔

کوئی پانچ سال بعد ایک بہت ہی غیر معمولی شخص اس کی ملازمت میں شامل ہوا۔ وہ آئرلینڈ کا باشندہ اور مشہور لڑاکا جارج ٹامس تھا۔ وہ بحریہ کا ملّاح تھا اور کسی جہاز پر چڑھ کر ہندوستان آیا تھا۔ جہاز کو چھوڑ کر وہ کرناٹک کے حکمرانوں کا ملازم رہا مگر اس کے ارادے کچھ کر گزرنے کے تھے، وہ کشاں کشاں دلّی پہنچا اور بیگم سمرو کا ملازم ہو

گیا (1787ء)۔ بیگم تو غضب کی مردم شناس تھی، اس نے جلد ہی ٹامسن کو اپنی فوج کے کمان دار اعلیٰ کے منصب پر پہنچا دیا۔ ٹامس بھی نہایت قابل اور ہنر مند انسان تھا۔ اس نے سکھوں اور بیگم کے دوسرے دشمنوں کے خلاف کئی معرکوں میں اپنی جرأت اور حوصلہ مندی سے ایسی دھاک بٹھائی کہ ہر ایک اس کا دم بھرنے لگا۔ ان کامیابیوں کے نتیجے میں وہ بیگم کا اعلیٰ مشیر اور معتمد بن گیا۔ اب سردھنا کی فوج بالکل یورپین فوج نظر آنے لگی اور ٹامس کی کمان میں وہ ناقابل تسخیر سمجھی جانے لگی۔ سردھنا کی شہزادی کے پڑوسی اس کی طاقت سے ڈرنے لگے۔

پھر وہ دن آئے جب پورے ہندوستان میں افراتفری پھیلنے لگی۔ مرہٹے تو بادشاہ پر بھی حاوی آگئے اور شمالی ہندوستان پر عملاً سندھیا کا راج ہو گیا۔ بادشاہ کی حاکمیت برائے نام رہ گئی۔ جے پور کا راجا پرتاپ سنگھ بادشاہ کو جو خراج بھیجا کرتا تھا وہ اس نے بند کر دیا اور علاقے کے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملا کر خود مختاری کا پرچم بلند کر دیا۔ اس کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے سندھیا بڑا لشکر لے کر چلا مگر خود اس کے ہاں غداروں کی کمی نہ تھی۔ اشرفی کی تھیلی کے بدلے بہت سے مغل امراء بھی دشمن کی آغوش میں جانے کو تیار تھے۔ اس کے بعد جو لڑائی ہوئی اس میں سندھیا کو

شکست ہوئی اور اس ہزیمت کے بعد وہ پسپا ہو کر گوالیار چلا گیا تا کہ دکن سے آنے والی کمک کا انتظار کرے۔ ادھر دلّی میں سندھیا کے نائب شاہ نظام الدین نے اس شکست کا حال سن کر حفظ ماتقدم کے طور پر دلّی شہر اور قلعے کے دفاع کے انتظامات شروع کر دیئے۔ یہ طوفان سر اٹھائے ہوئے تھا کہ پرانے روہیلہ باغی ضابطہ خان کے بیٹے غلام قادر نے، جو سہارن پور کا حاکم تھا، اپنے خواب پورے کرنے کی سوچی اور اپنی فوج لے کر جمنا کے مشرقی کنارے پر، یعنی دلّی کے مقابل جا پہنچا۔ اسے اپنی کامیابی کا پختہ یقین تھا کیونکہ اس نے بڑی چالبازی سے کام لے کر شاہی دربار کے ناظر کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یہ منظور علی تھا جس کا دربار میں کچھ زیادہ ہی اثر و رسوخ تھا۔ وہ بھی خوشی خوشی سازش میں شریک ہو گیا۔

سندھیا کے نائب شاہ نظام الدین کو روہیلہ سردار کی قوت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس نے اپنا ایک فوجی دستہ جمنا پار بھیجا تا کہ دشمن کو وہیں دبوچ لے لیکن اس کا یہ حملہ بری طرح ناکام ہوا اور لاشیں الگ گریں۔ شاہ نظام الدین تو وہیں حوصلہ ہار گیا۔ اسی دوران اسے خبر ملی کہ ناظر بھی غداری کے لئے پر تول رہا ہے، وہ اپنی جان بچانے کے لئے شہر سے دور بلّم گڑھ کے قلعے میں جا محصور ہو گیا۔

اب دلّی کی حالت برہنہ شہر جیسی تھی۔ بادشاہ محل کے کسی گوشے میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔ غلام قادر نے بڑی شان سے دریا پار کیا، بلا روک ٹوک بادشاہ کی قیام گاہ میں داخل ہوگیا۔ اس نے دہشت زدہ بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ اس کو امیر الامراء کی سند دی جائے۔ وہ سند تو سندھیا کو حاصل تھی۔ بادشاہ مرتا کیا نہ کرتا، کانپتے ہاتھوں سے سند پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

بیگم سمرو کو اپنے شہنشاہ کی اس حالتِ زار کی خبر ہوئی۔ اس نے اپنی فوج کو کمر بستہ ہونے کا حکم دیا اور طے کیا کہ خود جا کر بادشاہ کی حکمرانی بحال کرے گی۔ غلام قادر کو شاہی دربار میں بیگم کے اثر ورسوخ سے بے خبر نہ تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ بادشاہ کو رہائی دلانے کے لیے بیگم خود آ رہی ہے تو وہ چونکا۔ اسے خاتون کے غیض و غضب کا بھی پورا پورا اندازہ تھا۔ روہیلہ سردار خود چل کر بیگم کے خیمے میں پہنچا جو دلّی سے ذرا باہر نصب تھا۔ اس نے بیگم کو بہن کہہ کر پکارا اور اس سے اپنی قرابت داری جتانے لگا۔ بیگم سمرو اس کی چالاکیوں اور عیاریوں کے قصے سن چکی تھی۔ اس نے بظاہر غلام قادر کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ جب تم اپنی فوج لے کر دریا کے پار اتر جاؤ گے، میری چار پلٹن اور پچاسی توپیں تم سے جا ملیں گی۔ غلام قادر

جھانسے میں آ گیا اور اپنی فوج لے کر دریا کے پار اتر گیا۔ اس پر بیگم نے اس کی واپسی کی راہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی ایک پلٹن اور کچھ توپیں آراستہ کر دیں تاکہ وہ واپس نہ آ سکے۔ اس طرح، عبرت نامہ کے بقول، بادشاہ کو بچا لیا گیا۔

روہیلوں کی باتوں میں آ جاتی تو بلاشبہ بڑی دولت بیگم کے ہاتھ لگتی مگر اس نے وفاداری نبھائی اور اپنی پوری فوج لے کر محل میں پہنچ گئی۔ ادھر بیگم کی حمایت کرنے میں ناکامی پر غلام قادر آگ بگولا ہو گیا۔ وہ واپس دریا پار اپنے خیمے میں پہنچا اور اپنا ایلچی محل میں بھیجا اور مطالبہ کیا کہ بیگم کو فوراً محل سے نکالا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو جنگ چھیڑ دے گا۔ اس کا مطالبہ بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ اس پر اُس نے قلعہ پر گولا باری شروع کر دی۔ اسی مار دھاڑ کے دوران جاسوسوں نے خبر دی کہ شہزادہ مرزا جواں بخت بڑا لشکر لے کر دارالحکومت کی طرف آ رہا ہے۔ ناظر نے فوراً ہی غلام قادر کو خبر کر دی اور اسے رائے دی کہ بادشاہ سے صلح کر لے اور اپنے کیے کی معافی مانگے۔ یہی ہوا۔ اُس نے بادشاہ کو بھاری رقم کی پیشکش بھی کی اور دو آب کی وہ شاہی زمینیں لوٹانے کا وعدہ کیا جن پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔

ناظر کی بار بار کی سفارش پر بادشاہ نے تجویز مان لی، غلام قادر کو خلعت شاہی بھیجی گئی، اس نے بھی اپنے خیمے اکھاڑے اور واپس سہارن پور چلا گیا۔

قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔

دلّی کی بدحالی دیکھ کر کچھ اور زمین دار دلیر ہو گئے اور چونکہ دور بہت تھے اس لئے ہمت بڑھی۔ انہوں نے لگان روک لیا اور شاہی دربار کی اطاعت سے انکار کرنے لگے۔ ان میں راجپوتانا کا نجف قُلی خان بھی تھا۔ اس پر بادشاہ شاہ عالم اپنی فوج لے کر گوکل گڑھ کی طرف چلے تاکہ اس کو جھکنے پر مجبور کریں۔ ان کے ساتھ بیگم سمرو بھی تھی۔ بیگم نے وہ تین بٹالین فوج بھی ساتھ لے لی جس کی تربیت آنجہانی جنرل سمرو نے کی تھی اور جواب پوری طرح بیگم کی کمان میں تھی۔ اس فوج کے پاس بہت عمدہ توپ خانہ تھا جسے یورپین گولہ انداز چلاتے تھے۔ بادشاہ کے یہ فوجی گوکل گڑھ کے قلعے کی دیواروں کے ساتھ صف بنا کر بیٹھ گئے اور کھانے پینے میں مصروف ہو گئے، کھانے میں کم اور پینے میں زیادہ۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ قلعہ کے اندر موجود سپاہ نے اچانک نکل کر بادشاہ کی فوج کو

دبوچ لیا۔ اس پر فوج کی صف بندی منتشر ہوگئی اور حملہ آور آگے بڑھنے لگے۔ اب بادشاہ کا خیمہ توپوں کی زد میں تھا۔ بادشاہ پر کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا تھا۔ اس موقع پر بیگم سمرو کی بہادری کام آئی۔ اس کا خیمہ صف کی دائیں جانب تھا اور اس کی فوج اس اچانک حملے سے محفوظ تھی اور ہر صورت حال سے نمٹنے کے لئے مستعد تھی، یہی نہیں، فوج کی ایک ٹکڑی کی کمان جارج ٹامس جیسے لڑاکا کے ہاتھ میں تھی۔ یہ حالات دیکھ کر بیگم نے شاہ کو پیغام بھیجا کہ اگرچہ میرا خیمہ آپ کے شایان شان نہیں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ میرے پاس تشریف لے آئیں۔ میں آپ کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دوں گی یا آپ کی حفاظت کی خاطر مر مٹوں گی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نجف قلی خاں کو ایک رقعہ بھیجا جس میں اسے بادشاہ کی اہانت پر شرم دلائی اور دھمکی دی کہ تمہارے مزاج ایسے درست کئے جائیں گے کہ دنیا عبرت پکڑے گی۔ اس کے بعد یہ جرأت مند خاتون اپنے ڈولے میں سوار ہوئی اور اپنی فوج کے ایک دستے سے جا ملی۔ ساتھ میں چھ پاؤنڈ وزنی گولا پھینکنے والی ایک توپ تھی جس کی کمان ایک یورپین افسر کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بڑی بہادری سے

بڑھتی ہوئی باغیوں کے مقابل جا پہنچی، اپنی پالکی وہیں رکھنے کا حکم دیا اور اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ گولہ باری شروع کر دے۔ ساتھ ہی سپاہیوں نے اپنے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر کھول دیا۔ زور کا معرکہ ہوا۔ دشمن کے دانت کھٹے ہوئے اور لڑائی تھم گئی۔ بادشاہ کا خیمہ نصب ہوا، دربار لگا اور شاہ عالم نے بیگم سمرو کا شکریہ ادا کیا، اسے لباس فاخرہ عطا کیا اور اسے اپنی پیاری بیٹی قرار دیا۔

اپنی شکست پر نادم نجف قلی خاں، بیگم کے حضور پہنچا اور اس سے التجا کی کہ بادشاہ سے معافی دلوائے۔ بیگم سمرو نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور اس کی درخواست شاہ عالم کے حضور پیش کی۔ آخر ایک سوانگ رچایا گیا۔ بیگم سمرو، نجف قلی کو لے کر بادشاہ کے سامنے یوں پیش ہوئیں کہ اس کے ہاتھ ریشمی رومال سے باندھے گئے تھے گویا وہ قید تھا۔ بادشاہ نے یہ رومال کھولا اور اسے خلعت عطا کی۔ بادشاہ نے نجف قلی خاں کو مکمل طور پر معاف کر دیا۔ دربار میں اتنا اثر حاصل تھا 'کتانہ' کی اس چھوٹی سی عورت کو۔

اٹھارہویں صدی کے آخر ہونے تک ہندوستان کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ ہر علاقے کے حکمراں خودمختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ بیگم سمرو کو اپنی حاکمیت کو بچا کر رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اسے بادشاہ کی حمایت حاصل رہے۔ اپنے شوہر کے زمانے میں وہ رعیت کی نافرمانی، بے وفائی اور ہنگامہ آرائی کے کتنے ہی واقعات دیکھ چکی تھی اور ایک بات اچھی طرح سیکھ چکی تھی کہ نافرمانی ہونے لگے تو اسے کچل دیا جائے چاہے اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس نے سردھنا کے علاقے میں کھیتی باڑی پر توجہ دی اور عام لوگوں کی فلاح اور بہبود پر دھیان دیا۔ اس طرح جاگیر کی سالانہ آمدنی چھ لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ روپے ہوگئی۔ اس نے اپنی فوج کو بھی کمزور نہ ہونے دیا اور جنگی ساز و سامان کے انبار لگا دیئے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اڑوس پڑوس کے فرماں روا اس کے علاقے پر رال نہ ٹپکائیں۔ اس کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ اکیلی تھی، ایسی عورت کو کمزور تصور کیا جاتا تھا۔ شروع میں ایک بار ایسا ہوا کہ بیگم کو اپنا رعب قائم رکھنے کے لئے اپنی دو جوان

خادماؤں کو بے رحمانہ اور ظالمانہ سزا دینی پڑی۔ تاریخ میں تو یہ واقعہ محفوظ نہ تھا لیکن پچاس سال بعد جب چھان بین کی گئی تو پرانے وقتوں کے بڑے بوڑھوں نے اپنے حافظے سے کچھ حقیقت بیان کی اور کچھ اس میں رنگ آمیزی کی۔ کہتے ہیں کہ جائیداد پر اس کے دعویٰ کے نتیجے میں فوجیوں میں کچھ نافرمانی کے آثار نظر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں ان کی خدمت کا جائز صلہ نہیں مل رہا۔ کہتے ہیں کہ بیگم متھرا گئی ہوئی تھی کہ اسے خبر ملی کہ آگرہ میں اس کے گھر کو آگ لگ گئی اور قیمتی املاک جل کر راکھ ہوگئیں۔ پتہ چلا کہ اس کی دو خادمائیں گھر کا قیمتی ساز و سامان لے کر دو ملازموں کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔ فوراً ہی ان کی تلاش شروع ہوگئی اور وہ بازار میں کہیں چھپی ہوئی پکڑی گئیں۔ کہتے ہیں کہ بیگم نے حکم دیا کہ دونوں لڑکیوں کو اتنا مارا جائے کہ ان میں دم نہ رہے۔ اس کے بعد بیگم نے اپنے خیمے کے آگے ایک گڑھا کھدوایا اور لڑکیوں کو اس میں زندہ دفن کر دیا۔ یہی نہیں، اس نے اپنا بستر گڑھے کے اوپر لگوایا اور رات بھر وہیں سوئی۔ اب یقین نہیں آتا کہ اس نے اتنی بے رحمی کا مظاہرہ کیا ہوگا مگر اُس زمانے میں جرائم پر قابو پانے کے کچھ ایسے ہی ہتھکنڈے ہوا کرتے تھے۔

وہ اپنی جاگیر کا سارا بندوبست اپنی نگرانی میں چلاتی تھی اور سارے کام اس کے صوبیدار اور جمعدار کرتے تھے۔ اس کی فوج کی یورپین ملازموں کا علاقے کا انتظام سے کوئی تعلق نہ تھا البتہ بدنظمی پر قابو پانے یا محصول اکٹھا کرنے کے لئے ان سے کام لیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ حالات پر بیگم سمرو کا بہت کڑا کنٹرول تھا۔ اس زمانے کے ایک مورخ نے لکھا کہ دکن کے جو لوگ بیگم کو جانتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ کوئی چڑیل ہے جو اپنے دشمنوں پر اپنی چادر پھینکتی ہے اور وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

اس بات میں کتنا سچ ہے، اس سے قطع نظر لوگ اسے سچ ہی مانتے تھے، یہ بات بیگم کے حق میں جاتی تھی۔ اُس وقت ملک کے جو حالات تھے، ان میں اس طرح کے قصے ایک تنہا عورت کے لئے بہت سود مند تھے۔

دلّی کے دربار پر مرہٹوں کی گرفت مضبوط تھی لیکن اجمیر میں راجپوتوں کے ہاتھوں سندھیا کی شکست کے بعد دربار پر مرہٹوں کا پہلا جیسا اثر نہیں رہا۔ سندھیا کو ایسا کوئی نمائندہ نصیب نہ تھا جو اس کی غیر موجودگی میں بادشاہ پر نظر رکھے۔ بادشاہ تو شاید اپنے نصیب میں ذلت لکھوا

کر آئے تھے۔ وہ اپنے عیش و آرام میں ایسے پڑے کہ سارا نظم و نسق عملاً ان کے ناظر منظور علی کے ہاتھ میں چلا گیا جو پرلے درجے کا دغا باز اور مکار تھا۔ اور خود بادشاہ کا یہ حال کہ اپنے اس ناظر کو اپنا بے حد وفادار اور تابعدار ملازم تصور کرتا تھا۔ بچے کھچے مغلوں میں اگر کوئی قاعدے قرینے کا شخص تھا تو وہ بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا مرزا جواں بخت جہاں دار تھا جس نے محل اور دربار کے ان سارے قصوں سے الگ تھلگ دور فرید آباد میں بسیرا کر لیا تھا۔ اسے غلام قادر کی چیرہ دستیوں کی خبر ملی اور محل کی شرمناک صورت حال کا علم ہوا۔ اس نے دلّی جانے کا فیصلہ کیا تا کہ خاندان کے معاملات کو دیکھے، دارالحکومت میں نظم و ضبط قائم کرے اور مغلیہ سلطنت کا وقار بحال کرے۔

اُس وقت دلّی کی سیاست میں بیگم سمرو کو اہم مقام حاصل تھا۔ شہزادہ نے سوچا کہ ایسے میں بیگم سمرو کی مدد بہت کام آئے گی۔ اس نے اپنے ایک رفیق خیر الدین کو اپنا مختارِ کل وزیر بنا کر بھیجا کہ جا کر بیگم سے بات کرے۔ خیر الدین تیز رفتار گھوڑے پر چھ گھنٹے میں بیگم سمرو کے پڑاؤ پر پہنچا۔ بادشاہ کے جانشین شہزادے کے آنے کی خبر سن کر بیگم نے اپنا شان دار دربار آراستہ کیا جس میں سارے یورپین کپتان

حاضر تھے۔ وہ خود چلمن کے پیچھے بیٹھی۔ وہ سارے لمبے چوڑے آداب محفل انجام پانے کے بعد خیر الدین نے اپنے آنے کا سبب بیان کیا۔ اس کے اور بیگم کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ بیگم نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے شہزادے میں وہ ساری مردانہ اور جرأتمندانہ خوبیاں موجود ہیں؟'' جواب ملا۔ ''جلد ہی آپ کی اس سے ملاقات ہوگی، آپ خود ہی اس کی خوبیوں کو جانچ لیں گی۔'' اس پر بیگم بولیں۔ ''یہ کیا مذاق ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا وہ تلوار اٹھانے ااور بادشاہت لے لینے کا اہل ہے یا پھر ڈھول طبلہ بجانے کے قابل ہے۔'' خیر الدین نے کہا۔ ''اگر وہ ایسا بہادر اور جری نہ ہوتا تو آپ سے رجوع نہ کرتا۔ اگر وہ بزدل اور بدمست ہوتا تو آپ سے مدد نہ مانگتا۔'' اس پر بیگم نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ وہ سیماب فطرت ہے، گھڑی میں کچھ، گھڑی میں کچھ۔

عبرت نامہ میں لکھا ہے کہ بیگم نے طے کیا کہ اگلے روز جب شہزادہ اپنے باپ سے ملنے محل میں داخل ہوگا، وہ اپنے سپاہیوں کی ایک پلٹن قلعے کے اندر بھیج دیں گی۔ اس سے شہزادے کا حوصلہ بلند رہے گا اور وہ بادشاہ سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اسے اپنا جانشین مقرر کردے، جس کے

بعد شہزادہ قلعے ہی میں رہے گا اور ملک کے معاملات کو دیکھے گا۔

ان برے حالات میں ولی عہد شہزادے کی یوں آمد کی خبر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور اقتدار اسے سونپ دینے کے منصوبے بنانے لگے۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ محل کا شاہی خزانہ اور فوج براہِ راست شہزادے کے کنٹرول میں دے دی جائے۔

مگر یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہ تھا۔ مغل حکمرانی کے سورج کو گرہن لگنا کہیں ستاروں پر لکھا جا چکا تھا۔ بادشاہ سلامت اپنے ناظر منظور علی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور منظور علی کو شہزادے کی حاکمیت منظور نہ تھی۔ اس نے بادشاہ کے کان بھرنا شروع کئے اور ولی عہد کے خلاف کیسا کیسا زہر اگلا کہ وہ پیر پٹختا ہوا محل سے نکل گیا اور اس طرح ایک مایوس اور دل گرفتہ نوجوان بنارس جا کر مر گیا (مئی 1788ء)۔

اب دلّی میں نہ شہزادہ تھا اور نہ بیگم سمرو۔ شہر میں اب کہیں جائے پناہ نہ رہی۔ ایسے میں غلام قادر نے سوچا کہ یہی فیصلہ کن ضرب لگانے کا وقت ہے۔

اس کے ساتھ ہی خوف و دہشت کے نو بھیانک ہفتے شروع

ہوئے۔غلام قادر کو خوب یاد تھا کہ بادشاہ نے اس کے باپ ضابطہ خان کو ذلیل وخوار کیا تھا اور عنان حکومت اسے سونپنے سے انکار کیا تھا۔اسے شاہ عالم سے شدید نفرت تھی اور چاہتا تھا کہ باپ کا انتقام لے کر اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔اس کے علاوہ اسے دربار میں ہندوؤں کے اثر ورسوخ سے بھی چڑ تھی اور وہ سندھیا کے خلاف خود کو 'خدا کا قہر' قرار دیا کرتا تھا۔چنانچہ اس نے سب سے پہلے پیسے کا مطالبہ کیا تا کہ کافروں کے خلاف جہاد شروع کرے۔پیسہ بھی فراہم ہو گیا اور شاہ کا بیٹا سلیمان ضمانت کے طور پر غلام قادر کی چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔لیکن پیسہ ختم ہونے میں چار دن بھی نہ لگے اور غلام قادر کو یقین ہوا کہ بادشاہ نے بھاری رقم محل میں کہیں چھپا رکھی ہے۔

30 جولائی کو غلام قادر محل کے گیٹ پر پہنچا اور اندر آنے کی اجازت مانگی تا کہ قرآن اٹھا کر بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھائے۔ محل کے محافظوں نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے اندر نہ آنے دیا جائے مگر بادشاہ کے ناظر نے اس پر دباؤ ڈالا کہ گیٹ کھول دیا جائے۔اور جیسے ہی گیٹ کھولا گیا،ایک غلام قادر ہی نہیں،اس

کے دو ہزار فوجی بھی اندر گھس آئے اور محافظوں کو نکال باہر کیا۔
اس شور شرابہ کی آواز بادشاہ اور اس کے بیٹوں تک پہنچی تو پتہ چلا
کہ محل کے سارے اہلکار اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں اور
کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو جا کر اس ہنگامے کا سبب معلوم
کرے۔ اس کے بیٹے اکبر نے باپ سے کہا کہ اب ایک ہی
صورت ہے، وہ یہ کہ ہم سب جا کر غداروں پر ٹوٹ پڑیں۔ ہار
ماننے سے شہید ہو جانا بہتر ہے۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ جو
کچھ اللہ کو منظور ہے اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اس پر
شہزادہ اکبر نے اپنی تلوار نکال کر اپنے حلق پر رکھ لی تاکہ خود کو
مار لے۔ بادشاہ نے تلوار اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنی گردن
پر رکھ لی۔ اندر یہی کھینچا تانی ہو رہی تھی کہ اس کی خبر پا کر غلام
قادر محل سرا کی طرف لپکا۔ ذرا دیر بعد وہ بادشاہ کے سامنے کھڑا
تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ تمہیں جو پیسہ چاہئے تھا وہ دے دیا گیا۔
اب سندھیا کا پیچھا کرنے کی بجائے تم میری ہتک کر رہے ہو۔
اس پر غلام قادر نے بادشاہ کو مار ڈالنے کی دھمکی دی اور کہا کہ
بتاؤ شاہی خزانہ کہاں چھپایا گیا ہے۔ اور جب بادشاہ نے انکار

کیا تو اسے اور اس کے بیٹوں کو لے جا کر محل کی مسجد میں بند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی غلام قادر نے زنان خانے کو اپنی تحویل میں لے لیا لیکن ابھی تک خواتین محفوظ تھیں۔

اگلی صبح وہ دوبارہ بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ نے پھر وہی بات کہی۔ اس نے کہا کہ تمہیں دینے کے لئے اب میرے پاس کچھ نہیں۔ اسی دوران غلام قادر کے سپاہی دلّی کے سابق بادشاہ احمد شاہ کے بڑے بیٹے کو لے آئے۔ بادشاہ کو نہتا کر دیا گیا اور اسے اور اس کے بیٹوں کو لے جا کر قلعے کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ اسی دوران احمد شاہ کے بیٹے کو دیوان عام میں لے جا کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ نقارے بجے اور اسے جہاں شاہ کا لقب دے کر بادشاہ قرار دے دیا گیا۔ جب شہر کی مسجد کے امام نے پوچھا کہ خطبے میں کس بادشاہ کا نام لیا جائے تو غلام قادر نے کہا۔ ''اللہ اور اس کے رسولؐ کا۔''

اس موقع پر سابق بادشاہ محمد شاہ کی دو بیواؤں کو محل میں طلب کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ خود حرم کی مالک تصور کریں۔ انہوں نے فوراً ہی حرم کی تلاشی شروع کی اور جتنا زیور اور قیمتی اشیاء ہاتھ لگیں، غلام قادر کے حوالے کر دیں۔ اس دوران غلام قادر کے آدمی پورے محل میں

فرش اکھاڑنے لگے اور دیواروں کو ٹھونک بجا کر خزانہ ڈھونڈنے لگے۔ محل کی اور زیادہ تلاشی کے لئے عورتوں کا پورا دستہ بلا لیا گیا۔

اگلے روز چیخوں کی آوازیں آتی رہیں، محل میں رہنے والوں کو مار مار کر خزانے کا پتہ پوچھا جا رہا تھا۔ ملازموں کو تپتی آگ کے اوپر پکڑ کر پوچھا گیا کہ زیورات کہاں چھپائے گئے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے جسم پر کھولتا ہوا تیل ڈالا گیا۔ خواجہ سراؤں کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ خود بادشاہ کو قید سے نکال کر تپتی ہوئی دھوپ میں بٹھا دیا گیا اور بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ خود غلام قادر حقہ پیتا رہا اور اس کا دھواں بادشاہ کے منہ پر چھوڑتا رہا۔ بادشاہ مسلسل یہی کہتا رہا کہ جو کچھ تھا گودام میں رکھا تھا جس کو اچھی طرح چھان لیا گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں نے خزانہ اپنے پیٹ میں چھپا رکھا ہے۔'' اس پر غلام قادر نے کہا کہ اس کو باہر نکالنے کے لئے ایک خنجر کافی ہے۔

غلام قادر کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ اگست کی دس تاریخ تھی، بادشاہ مسلسل انکار کئے جا رہا تھا۔ غلام قادر نے کہا کہ سارا سونا میرے حوالے کر دو ورنہ تمہیں بھی مار ڈالوں گا۔ اس پر شاہ عالم نے کہا۔ ''میرا سر قلم کر دو کیونکہ اس طرح جینے سے مر جانا اچھا۔'' اس پر غلام قادر جھپٹا

اور بادشاہ کو گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ قندھاری خان اور پر دل خان نے اس کے ہاتھ پکڑے اور دو آدمیوں نے اس کی ٹانگیں پکڑیں۔ قندھاری خان نے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال لی اور اس خون کے پیاسے بدمعاش نے اپنے ہاتھوں سے دوسری آنکھ نکال لی۔ بادشاہ چیختا چلاتا ہی رہ گیا۔ یہی نہیں غلام قادر نے ایک مصور کو بلایا اور اس سے کہا کہ میری تصویر بناؤ جس میں خود میں خنجر لئے شاہ عالم کے سینے پر چڑھا بیٹھا اس کی آنکھیں نکال رہا ہوں۔ (ایک روایت ہے کہ بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں۔) غلام قادر نے بادشاہ سے پوچھا کہ تمہیں کچھ نظر آرہا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "نہیں، البتہ مجھے اپنے اور تمہارے درمیان قرآن دکھائی دے رہا ہے۔"

نیم مردہ بادشاہ کو لے جا کر قید خانے میں ڈال دیا گیا وہ بھی بھوکا اور پیاسا۔ اس کے ایک ملازم نے اس کے لئے کچھ لے جانا چاہا تو ملازم کو وہیں قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دو ملازموں اور ایک سقّے کو اپنے آقا پر ترس آیا، ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ غلام قادر نے باقی شاہی کنبے کا کھانا پانی بند کر دیا، کچھ ہی عرصے بعد بچے اور بوڑھی عورتیں بھوک سے مرنے لگیں۔ غلام قادر نے حکم دیا کہ ان کی

لاشیں یہیں سڑنے دی جائیں۔اس پر زنان خانے میں بدبو پھیلنے لگی۔

اب شاہی خاندان کی خواتین کی باری تھی۔انہیں اچھی طرح لوٹا گیا۔حرم کی خواتین کے ساتھ ایسا سلوک نادر شاہ، احمد شاہ درّانی اور بھاؤ تک نے نہیں کیا تھا۔غرض پچاس ساٹھ سال کے جمع کئے ہوئے اثاثے چھین لئے گئے۔

ایک روز دو نوجوان شہزادیاں غلام قادر کے سامنے لائی گئیں جن کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ بہت خوب صورت ہیں۔ان کے چہرے پر نقاب تھی۔اس نے حکم دیا کہ نقاب کو اتار پھینکو۔ پھر اس نے شہزادیوں کو چھو کر اور ان کے بدن ٹٹول کر دیکھا۔اس کے ساتھیوں نے غلیظ فقرے چست کئے۔اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی، غلام قادر کے ساتھ آنے والے سکھوں میں سے ایک سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا کہ اب اگر شہزادیوں کو ہاتھ لگایا گیا تو وہ اور اس کے ساتھی آپ سب کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔اس پر شہزادیوں کو رہائی ملی۔ ورنہ غلام قادر اپنے سپاہیوں کو آواز دے رہا تھا کہ ان سب کو اپنی لونڈی بنالو۔ اسے بتایا جارہا تھا کہ تمہارے اس رویے سے تمہارے کچھ سردار

ساتھ چھوڑ جائیں گے مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے شاہ عالم کے بیٹوں کو طلب کر لیا اور انہیں حکم دیا کہ ناچ کر دکھائیں۔ جب لڑکوں نے انکار کیا تو اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ جو ناچنے سے انکار کرے اس کی ناک کاٹ لی جائے۔ کسی نے انکار نہیں کیا۔ پھر اس نے شہزادہ اکبر کو زبردستی شراب پلائی اور ناچنے پر مجبور کیا۔ غلام قادر نے پھر یہ کیا کہ سب کو باہر نکالا اور خود ایک مغل شہزادے کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔ اس نے ڈاب میں ایک طرف بڑا سا خنجر گھڑس رکھا تھا اور دوسری طرف تلوار لٹک رہی تھی۔ جب وہ جاگا تو شہزادے سے بولا۔ ''تم کتنے بزدل ہو، جب تم میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھے مار ڈالتے، تم حکومت کیا خاک کرو گے؟'' غرض اس روز تاریخ نے ایسے ایسے منظر دیکھے کہ مورخوں نے انہیں تحریر کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ شاہی محل کے بعد امراء کی حویلیوں کی باری تھی۔ ان کا قیمتی لباس اور فرنیچر تک لوٹا گیا۔ غلام قادر نے جامع مسجد کے گنبدوں پر منڈھا ہوا سونا بھی لوٹنے کا حکم دے دیا۔ ایک گنبد لٹ چکا تھا کہ اسی سکھ کمانڈر نے، جس نے شاہزادیوں کو بچایا تھا، اعلان کیا کہ اس

حرکت پر مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اور ہم بھی بغاوت کر دیں گے۔

ایک روایت کے مطابق پچیس کروڑ لوٹے گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ڈیڑھ کروڑ لٹے۔ غلام قادر کے ہمراہیوں کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ مال غنیمت میں بڑے حصے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ مگر انہیں کم حصہ پیش کیا گیا۔ بات اتنی بڑھی کہ شہر دلّی دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ کل تک جو غلام قادر کے ساجھے دار تھے، آج سندھیا کی فوج کا انتظار کرنے لگے اور جوں ہی (14 ستمبر) رعنا خان کی کمان میں دے کر بھاری لشکر شہر کی طرف روانہ کیا گیا، پتہ چلا کہ غلام قادر سے ٹوٹ کر الگ ہو جانے والی فوج دلّی کے نواح میں کھڑی ان کا انتظار کر رہی ہے۔ 28 ستمبر کو ان دونوں فوجوں نے پرانے شہر پر قبضہ کر لیا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ بیگم سمرو نے اپنی نہایت اعلیٰ فوج بھیج کر پوری کر دی۔ چند چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد غلام قادر کے آدمیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ غلام قادر نے دیکھا کہ وہ قلعے پر قابض نہیں رہ سکتا، وہ اپنی لوٹی ہوئی دولت اور کچھ شہزادوں کو بطور یرغمال ساتھ لے کر دریا پار اتر گیا۔ اس کے جانے کے بعد قلعہ

کے بارود خانے میں بڑا دھماکہ ہوا۔ اسے یہ کہتے سنا گیا کہ قلعہ بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ پھر یہ غضب ہوا کہ اس کے قافلے کو راہ میں سکھوں اور دوسرے لوگوں نے لوٹنا شروع کر دیا۔

رعنا خان کے اگلے دستے قلعے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے قیدیوں کی آہ و بکا سنی تو اندازہ ہوا کہ شاہی خاندان کے کچھ لوگ اندر موجود ہیں۔ ان سب کو رہائی ملی۔ بادشاہ کو جس کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا وہ خود کو اسی میں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ مرہٹہ کمانڈر نے بڑی منت سماجت کر کے انہیں باہر آنے پر رضا مند کیا اور انہیں وہ عزت دی جو بادشاہ کو دی جاتی ہے۔ سب لوگ کئی روز کے بھوکے تھے۔ انہیں کھانا پانی بھیجا گیا۔ اب شہر میں غلام قادر کے آدمیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور لوٹا ہوا مال واپس لیا جانے لگا۔ 16 اکتوبر کو تباہ حال دیوان عام میں کمانڈر اور دوسرے سرکردہ لوگوں نے دربار سجایا اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ بادشاہ کو تخت پر بٹھایا گیا اور مسجد میں اس کے نام کا خطبہ دیا گیا۔ بادشاہ کی ایک ہی خواہش تھی۔ غلام قادر کو پکڑا جائے اور ایسی سزا دی جائے کہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھے۔

ادھر وہ 'عذابِ الٰہی' دلّی سے بھاگا تو رستے میں مرہٹوں نے اسے ہراساں کرنا شروع کیا۔ اگرچہ اس نے جمنا کی کشتیاں جلا دی تھیں، مگر مرہٹوں اور بیگم سمرو کی فوجوں نے اس کا پیچھا شروع کیا۔ فرانسیسی افسر کی قیادت میں ایک بٹالین شہر میں چھوڑ دی گئی تاکہ وہ قلعے کی حفاظت کرے۔ غلام قادر کا تعاقب کرنے والوں کے ساتھ جاٹ بھی آ ملے اور پیشوا کے بھیجے ہوئے مرہٹے بھی اس تعاقب میں شریک ہو گئے۔ غلام قادر اپنے علی گڑھ کے قلعے تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اسے خبر ملی کہ قلعے کے کمانڈر نے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ راستے میں ڈاکو اور لٹیرے چھاپے مارتے رہے۔ وہ 4 نومبر کو میرٹھ پہنچا اور قلعہ بند ہو گیا مگر اس کا ایسا محاصرہ کیا گیا کہ قلعے کے اندر لوگ اور جانور بھوکے مرنے لگے۔ آخر اس نے پیش کش کی کہ وہ مغل شہزادوں کو چھوڑ دے گا، اسے آزاد کر دیا جائے۔ مذاکرات ناکام ہوئے تو اس نے جھلا کر دھمکی دی کہ وہ یرغمالیوں کو قتل کر دے گا۔ لیکن اسے اسی سکھ کمانڈر نے باز رکھا جس نے دو موقعوں پر مداخلت کی تھی۔ آخر اسی کمانڈر کی مدد سے وہ رات کی تاریکی میں نکل بھاگا۔

اس کے ساتھ پانچ سو گھوڑ سوار تھے۔ راہ میں مرہٹہ دستوں سے ان کی مڈ بھیڑ ہوئی اور رات کے اندھیرے میں وہ اپنے سپاہیوں سے بچھڑ گیا۔ اب وہ پیدل ہی بھاگا۔ آخر ایک گاؤں میں پہنچا اور ایک مکان میں پناہ مانگی۔ اس نے مکان کے مالک کو اپنے ہاتھ کی انگوٹھی پیش کی تا کہ وہ اسے فرار کی راہ دکھا دے اور گھوڑا فراہم کر دے۔ مکان کا مالک اتنی قیمتی اور شاہانہ انگوٹھی دیکھ کر معاملے کو سمجھ گیا اور اپنا ایک ہرکارہ بھیجا تا کہ وہ تعاقب میں آنے والوں کو خبر کرے۔ راہ میں اسے پیشوا کا کمانڈر مل گیا جس نے سارا حال سنا اور اپنا گھوڑا سوار دستہ بھیجا تا کہ وہ مکان کا محاصرہ کرے اور غلام قادر کو پکڑ لے جسے مکان کے مالک نے قیدی بنا کر رکھا تھا۔ یہ بات 19 دسمبر 1788ء کی ہے۔

جب غلام قادر پکڑا کر لایا گیا، اس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں اور گردن میں لوہے کا طوق تھا۔ اسے ایک بیل گاڑی میں ڈالا گیا اور بھاری فوج کے ساتھ سندھیا کے شہر متھرا بھیج دیا گیا۔ مرہٹوں کی چھاؤنی میں پہلے تو اس کی آؤ بھگت ہوئی، اچھا لباس اور عمدہ کھانا دیا گیا اور پھر بڑے پیار سے پوچھا گیا کہ جو خزانہ لوٹ کر

لائے ہو وہ کہاں ہے؟ غلام قادر نے کہا کہ اسے خبر نہیں خزانہ کہاں گیا۔ اگرچہ راہزنوں نے اس پر ہاتھ صاف کیا تھا لیکن بالکل صفایا بھی نہیں کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کافی مقدار میں جواہرات فرانسیسی فوجی Lesteneau کے ہاتھ لگے۔ تفصیل معلوم نہیں لیکن یہ پتہ ہے کہ اس کے بعد وہ شخص فرانس چلا گیا۔

سندھیا غلام قادر کو شاید کچھ عرصے زندہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ کچھ دولت ہاتھ آ جائے لیکن اسی دوران اسے شاہ عالم کا خط ملا، اسے اس تاخیر کا علم ہوا تو اس نے لکھا کہ مجھے نابینا کرنے والے سے انتقام کیوں نہیں لیا جا رہا ہے۔ اس نے لکھا کہ اگر اس ظالم کو زندہ چھوڑ دیا گیا تو میں تخت سے دست بردار ہو کر مکہ چلا جاؤں گا۔ اس پر سندھیا نے حکم دیا کہ غلام قادر اور بادشاہ کے غدار ناظر کو ایذا دے دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ غلام قادر کے کان کاٹ کر اس کے گلے میں لٹکا دیئے گئے۔ پھر اس کا منہ کالا کر کے بیل گاڑی میں ڈال کر شہر میں گھمایا گیا۔ اگلے روز اس کی ناک اور ہونٹ کاٹے گئے اور شہر میں نمائش کی گئی۔ پھر اس کے ہاتھ کٹے اور پھر پیر کاٹے گئے، بالآخر اس کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کی لاش

ایک درخت پر الٹی لٹکا دی گئی۔اس کے کٹے ہوئے کان، ہونٹ اور آنکھیں شاہ عالم کے پاس دلّی بھیج دی گئیں۔ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس کی لاش بھیجی جائے جس کی شہر دلّی میں نمائش ہو لیکن عجیب واقعہ ہوا۔تیسرے دن اس کی لاش غائب ہوگئی۔اب اس کی نہ کہیں قبر ہے نہ کہیں کوئی نشان ہے۔رہ گیا عیار اور مکار ناظر، اس کو اس کے جرم کی سزا یوں ملی کہ اس کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچل دیا گیا۔

اب یہ خبر نہیں کہ اس ساری کارروائی کے بعد بادشاہ ہندوستان شاہ عالم کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑی یا نہیں۔مگر یہ خبر ہے کہ غلام قادر کی ماں نے سندھیا کو منہ بھر بھر کے کوسا۔اس کے بیٹے کی اس بے رحمانہ ہلاکت کے فوراً بعد سندھیا کو بخار ہوا۔اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔لیکن جلد ہی اس کے چہرے پر ورم نمودار ہوا اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر یہ ورم بڑھ کر گردن اور سینے تک پھیل گیا۔علاج ہوا مگر کسی دوا نے کوئی اثر نہیں کیا۔جون 1789ء کے پہلے ہفتے تک اس کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ وہ کسی فرنگی ڈاکٹر کو بلانے کی سوچنے لگا کیونکہ سارے حکیم اور وید ناکام ہو چکے تھے۔اس کے دربار میں موجود برطانوی ریذیڈنٹ نے اپنا سرجن بھیجنے کی پیشکش کی لیکن انکار کر دیا گیا کیونکہ سندھیا کے

وزیروں کا خیال تھا کہ غیر ملکی شخص ان کے آقا کو زہر دینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ادھر جو ورم تھا اس میں چھالے نمودار ہونے لگے جو پھر پھوٹنے لگے، اس کی تکلیف بہت شدید تھی۔ اب تک اس کے معالج مریض کو آرام پہنچانے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر ان کی دوائیں کام نہیں کر رہی ہیں تو بیماری کا سبب جادو ٹونا ہوسکتا ہے۔ نجومی طلب کئے گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ معالجوں کا خیال صحیح ہے۔ ہدایت کی گئی کہ اس جادو منتر میں کس کا ہاتھ ہے، فوراً تلاش کیا جائے۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ براندابن میں ایک عورت کو کہتے سنا گیا ہے کہ اس نے سندھیا پر جادو کیا ہے۔ اسے فوراً ہی پکڑ کر سندھیا کے سامنے لایا گیا۔ عورت نے اقرار کیا کہ اس نے سندھیا کو ہلاک کرنے کے لئے جادو کیا ہے اور یہ کام اس نے ہمت بہادر کے کہنے پر کیا ہے۔ ہمت بہادر بڑا ہی لڑاکا بھی تھا اور سادھو بھی تھا۔ وہ لڑائیوں میں ہارتے ہوئے فریقوں کو اپنی خدمات پیش کیا کرتا تھا۔ جیسے ہی اس کا قصور ثابت ہوا، سندھیا کو نئے منتر پڑھوائے گئے اور اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ وہ دوبارہ اقتدار کے لئے لڑی جانے والی جنگوں میں الجھ گیا۔

بیگم سمرو کے سر پر ایک نئی مصیبت نازل ہونے والی تھی۔

وہ خوش شکل تھی، اپنے چھوٹے سے قد کی وجہ سے کم عمر نظر آتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ خوب خوب دولت مند تھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب غلام قادر جیسا سخت گیر روہیلہ، بیگم سمرو سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جلد ہی بیوہ ہوگئی تھی اور کئی برسوں سے تنہا تھی اس لئے اس کے امیدواروں کو یقین تھا کہ وہ شادی پر رضا مند ہو جائے گی۔ لیکن ایک عجب بات تھی۔ اس کی رغبت یورپین فوجیوں کی طرف تھی جس کی پہلی مثال خود سمرو صاحب تھے۔ بالکل ان پڑھ تھے، ہندوستان آنے سے پہلے کہیں کوئی معمولی سپاہی تھے۔ یہی حال دوسرے ولایتی فوجیوں کا تھا۔ ان میں ایک دو کے سوا کوئی باکمال سپاہی نہیں تھا۔ چند ایک نے تو کبھی رائفل اٹھائی بھی نہیں تھی۔ پھر کیا ہوا کہ ہندوستان آ کر انہوں نے فوجی بن کر خوب دھاک جمائی اور بڑے جرنیل بن گئے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ان کو قدرت نے جو موروثی ذہانت عطا کی تھی، وہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں ان کا پلّہ بھاری رکھتی تھی۔

اب جو گورا فوجی بیگم کی زندگی میں داخل ہوا اور جسے تاریخ جارج ٹامس کے نام سے یاد رکھے گی، وہ بھی نرا اَن پڑھ تھا مگر بڑی بہادری سے لڑتا تھا اور گوکل گڑھ کی لڑائی میں بادشاہ کی جان بچا کر وہ بڑا ہیرو بن گیا تھا۔ ایسی ہی کچھ ادائیں تھیں کہ بیگم سمرو اس کی طرف مائل ہوئیں اور اسے پرگنہ ٹپال کا ناظم اور کمانڈر بنا کر بھیجا تاکہ وہ جاگیر کے اس علاقے کا نظم ونسق چلائے۔ اس نے علاقے کا نظام بڑی خوبی سے چلایا اور سکھوں کو بھی علاقے سے دور رکھا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جارج ٹامس بیگم کی رعیت میں بھی بہت مقبول تھا۔ کسی معمولی گھرانے سے آیا تھا اس لئے ہر ایک سے ملتا جلتا تھا اور سب ہی کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، عام لوگ اسے بہت چاہنے لگے تھے۔

اسی دوران ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس کا پہلے سے کسی کو احساس نہ تھا۔ ایک فرانسیسی کمانڈر جس کا نام لاوسو Le Vassoult تھا، بیگم کی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ تمام فرنگی کمانڈروں کے مقابلے میں بڑا خوب رو، سلیقہ مند، مہذب اور تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ بیگم اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگئی۔ وہ چالیس برس سے اوپر کی ہو چکی تھی اور اپنی اس سخت

دشوار زندگی میں سے وہ گرمجوشی اور چاہت نصیب نہیں ہوئی تھی جو ہر باشعور عورت کو درکار ہوتی ہے۔ ایسے میں لاوسو اس کی زندگی میں یوں آیا جیسے پریوں کی کہانیوں میں شہزادے آیا کرتے ہین۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ دونوں کمانڈروں کے درمیان ٹھن گئی۔ ادھر سپاہیوں کے درمیان بھی گروہ بندی ہو گئی اور آخر کار جارج ٹامس بیگم سمرو کی ملازمت کو خیر باد کہہ کے چلا گیا۔ اس صورت حال سے بیگم کا علاقہ لرز اٹھا۔ اس کے دوستوں نے، یہاں تک کہ بادشاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہارا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ پھر یہ ہوا کہ بادشاہ کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہوتی نظر آنے لگی۔

لاوسو نے پہلا کام یہ کیا کہ جارج ٹامس کے خلاف اچھی بھلی مہم چلائی اور یہ بات مشہور کر دی کہ وہ بیگم کے خلاف بغاوت کی سازش کر رہا ہے۔ اس نے فوج کے دوسرے فرانسیسی افسروں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ایک افواہ یہ اڑی کہ بیگم کو یقین ہے کہ جارج ٹامس کسی کم عمر عورت کی طرف مائل ہے۔ ان ہی حالات کے دوران بیگم اور لاوسو نے شادی کر لی (1793ء)۔ دو فرانسیسی افسر گواہ بنے۔ بیگم نے صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسیحی نام میں نوبلس Nobilis کا اضافہ کر لیا۔

اس کا خیال تھا یہ نام زیادہ شاندار ہے۔ البتہ اپنے سابق شوہر کا نام بھی برقرار رکھا ''جوآنا نوبلس سومر۔''

اگرچہ یہ شادی خفیہ رکھی گئی تھی لیکن اس کے افسروں اور سپاہیوں کو جلد ہی خبر ہوگئی۔ علاقے کے لئے یہ خبر کسی بھونچال سے کم نہ تھی۔ اوپر سے یہ غضب ہوا کہ بیگم سمرو کو اچھے برے کی تمیز نہ رہی۔ اس نے ٹامس کو تباہ کرنے کی ٹھان لی اور بھاری فوج لے کر اس کے علاقے یعنی ٹپال پر چڑھ دوڑی۔ اس کی فوج میں جو بددلی پھیلی ہوئی تھی وہ اس سے یوں بے خبر رہی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ حملے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ فوج نے بغاوت کر دی۔ سب کچھ تتر بتر ہو گیا۔ ساری فوج کشی دھری کی دھری رہ گئی اور بیگم کو بھاگم بھاگ واپسی کی راہ لینی پڑی۔ ادھر سردھنا میں موجود اس کی فوج اس کے سوتیلے بیٹے ظفریاب خان کو اپنا حاکم بنانے پر تل گئی۔ حالات اتنے بگڑے کہ بیگم کو انگریزوں سے رحم کی درخواست کرنی پڑی۔ اس نے گورنر جنرل سر جان شور کے نام عرضی لکھی کہ میری زندگی مشکلوں اور پریشانیوں کا شکار ہے، میں ان دشواریوں کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چاہتی ہوں کہ سبکدوش ہو کر باقی زندگی انگریز حکومت کی حفاظت میں گزاروں۔ آپ کی اطاعت

گزار بن کر رہوں گی۔ یہی میرے تحفظ اور کفالت کی واحد امید ہے۔

ایسی جراتمند خاتون کی اس التجا کا گورنر جنرل پر بڑا اثر ہوا۔ اس کی کونسل نے یہ جواب دینے کا فیصلہ کیا کہ تمہیں اپنے کنبے اور ملازموں کے ساتھ پٹنہ میں رہنے کی آزادی ہے مگر اپنی فوج ساتھ نہ لانا۔

پھر ایک رات بیگم اور لاوسو سب سے چھپ کر سردھنا سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے سے پہلے دونوں نے پیمان باندھا کہ اگر ان کا پیچھا کیا گیا اور ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیں گے۔ اب لاوسو اپنے گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور بیگم پیچھے اپنی پالکی میں بیٹھی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا، سو طرح کے قصے سننے میں آئے لیکن ہوا یہ کہ لاوسو نے پالکی کے اندر کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ گھوڑا موڑ کر واپس آیا تو اس نے بیگم کا کرتا سرخ رنگ میں تر دیکھا۔ ادھر لاوسو نے کہا کہ اسے مرجانا منظور ہے، وہ ان بدمعاشوں کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہوگا۔ اس یقین کے ساتھ کہ بیگم نے وعدہ نبھایا ہے، لاوسو نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی اور بے دم ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ تعاقب میں

آنے والوں نے ، جو کہ کل تک اس کے خادم تھے، اسے دبوچ لیا اور اس کی لاش کی جتنی بھی بے حرمتی ہو سکتی تھی وہ کی اور آخر اسے گڑھے میں پھینک دیا۔ اب بیگم کی باری تھی کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں خوار ہو۔ اس نے اپنے اوپر خنجر کا وار کیا لیکن وہ پسلیوں میں الجھ گیا اور اسے کاری زخم نہیں آیا۔ اس میں دوسرا وار کرنے کی ہمت نہ تھی، اگلے ہی لمحے وہ باغیوں کی قید میں تھی۔ وہ ساتھ میں جو ایک لاکھ روپئے اور اتنی ہی مالیت کے جواہرات لے کر چلی تھی، وہ چھن گئے اور یہ ساری دولت اور بیگم کو لے کر یہ لوگ واپس سردھنا چلے۔ اسے پرانے قلعے لے جایا گیا اور تپتی ہوئی دھوپ میں ایک توپ سے باندھ دیا گیا۔ وہاں وہ سات روز تک بندھی رہی اور اس دوران لوگ اس پر آوازے کس کر اس کی توہین کرتے رہے۔ ان لوگوں نے اس کا کھانا پینا تک بند کر رکھا تھا اور شاید چاہتے تھے کہ وہ اسی حالت میں مر جائے لیکن اس کی خادماؤں سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور وہ چوری چھپے اس کے زندہ رہنے کے جتن کرتی رہیں۔ اس دوران اس کے سوتیلے بیٹے ظفریاب خاں کی تو قسمت جاگ گئی۔ اس نے جھٹ جائیداد پر قبضہ کر لیا اور خرمستیاں شروع کر

دیں۔ یوں لگا کہ علاقے کی ساری عزت، سارا احترام، سب کچھ خاک میں مل گیا۔ بیٹے نے انگریزوں کو چٹھیاں لکھنی شروع کیں کہ میں نے ماں کو مرنے سے بچایا ہے اور ماں نے اپنا سب کچھ میرے نام لکھ دیا ہے، چنانچہ آپ بھی مجھے اس جاگیر کا مالک قرار دیں۔ سفید فام حکام کو محسوس ہوا کہ یہ ساری جعل سازی ہے اور انہوں نے لکھا کہ ہم بیگم سے ان تمام باتوں کی تصدیق چاہیں گے لیکن ہمیں احساس ہے کہ ہماری اس خاتون تک رسائی نہیں ہوگی۔

ولایتی افسروں کی مداخلت کی وجہ سے بیگم کو رہائی تو مل گئی لیکن اب وہ بے یارومددگار ہو کر رہ گئی۔ ایسے میں اسے ایک شخص کا خیال آیا جو اگرچہ اس سے روٹھ کر چلا گیا تھا مگر اچھے دنوں میں بیگم نے اس پر احسان بھی بہت کئے تھے اور وہ تھا جارج ٹامس۔ اب چونکہ اس کا حریف بھی راہ سے ہٹ چکا تھا، خیال تھا کہ وہ بیگم زیب النسا سمرو کی مدد کو آئے گا۔ خیال صحیح تھا۔ جارج نے، جو اَب مرہٹوں کے ساتھ تھا، خود چل کر بیگم کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی پوری فوج لے کر علاقے کے گاؤں کھتولی تک پہنچا جو سردھنا سے آٹھ کوس دور تھا۔ وہاں اس نے اعلان کیا کہ اگر بیگم کو اس کے جائز مقام پر

بحال نہ کیا گیا تو اس کی راہ روکنے والوں کو بخشا نہیں جائے گا۔اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔سردھنا کی فوج کے ایک بڑے حصے نے بیگم کے سوتیلے بیٹے ظفریاب خان کے خلاف بغاوت کر کے اسے قید کیا اور بیگم کی حاکمیت کا اعلان کر دیا۔ان تمام باتوں کے باوجود جارج آگے بڑھنے میں محتاط رہا کیونکہ بار بار بغاوت کرنے والی فوج پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔وہ اپنے بہترین گھوڑسوار دستے کو لے کر چھاؤنی میں داخل ہوا۔اس کے پیچھے پیچھے اس کے پیدل دستے تھے۔سردھنا کے فوجیوں کو خیال ہوا کہ ان کے ساتھ مرہٹے بھی چلے آرہے ہیں۔انہوں نے جھٹ اطاعت قبول کر لی اور ایسے فرماں بردار بن گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔یہ بات جون، جولائی 1796ء کی ہے۔پورا ایک سال لگا بیگم زیب النساء سمرو کو اقتدار میں دوبارہ مسند نشیں ہونے میں۔اس کام کے لئے مرہٹوں سے جتنی رقم طے ہوئی تھی وہ ادا کر دی گئی اور فوج کی کمان فرانسیسی افسر ژاں سلیور کو سونپ دی گئی۔وہ نیک بندہ اس پورے عرصے بغاوت سے الگ تھلگ رہا بلکہ توپوں سے بندھی بیگم کو اسی نے دوڑ دھوپ کر کے رہائی دلوائی تھی اور اپنے ساتھی افسروں کو بھی قابو میں رکھا تھا۔

اقتدار پر ڈاکہ ڈالنے والے بدنصیب ظفریاب سے ساری دولت واپس لے لی گئی اور اسے قیدی بنا کر دلّی بھیج دیا گیا جہاں وہ مر گیا (1802ء)۔ کہا جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس کی میت آگرہ لے جا کر باپ کے پہلو میں دفن کی گئی۔

بیگم جب تک زندہ رہی، جارج ٹامس کی احسان مند رہی۔ بعد میں جب ٹامس پر بُرا وقت پڑا، اس نے واپس یورپ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سردھنا گی اور اپنی بیوی ماریہ، ایک بیٹی اور تین بیٹوں کو بیگم کے حوالے کر دیا۔ بیگم نے خوشی خوشی انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا اور ان کی گزر بسر کا ایسا بندوبست کیا جو ٹامس کی موت کے بعد تک جاری رہا۔ اس کا انتقام اگست 1802ء میں بہرام پور میں ہوا۔ بیگم نے ماریہ کے بڑے بیٹے جان ٹامس کو گود لے کر اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنے ایک آرمینیائی ملازم آغا وانس کی بیٹی سے اس کی شادی کر دی۔ بیگم نے اپنی وصیت میں جارج کے کنبے کے لئے چوالیس ہزار روپئے چھوڑے۔

بیگم کو احساس ہوا کہ لاوسو سے شادی کر کے اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ اقتدار کی مسند سنبھالنے کے بعد اس نے کانوں کو

ہاتھ لگائے کہ دل کے معاملوں کی آنچ اپنے اقتدار کے معاملوں تک نہیں آنے دے گی۔

اس دوران بغاوت کرنے والے سپاہیوں نے اپنے دل کی بات کھل کر بیان کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ بیگم نے اس فرانسیسی افسر سے شادی کر کے ان کے اصل کمانڈر یعنی سمرو کی روح سے بے وفائی کی جو اِن کے لئے نا قابل برداشت تھی۔ بیگم نے بھی اپنے پہلے شوہر کی یاد تازہ رکھی اور اپنی خفیہ شادی کا پھر کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ یوں بھی بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔

جس وقت جنرل سمرو نے سردھنا میں اپنی حاکمیت کی بنیاد رکھی، انگریزوں نے بنگال میں جڑیں پکڑ لی تھیں لیکن بالائی ہند اور دکن پر ان کی ویسی گرفت نہ تھی۔ مرہٹوں کا اگر کوئی سردار انگریزوں کا دوست تھا تو وہ سندھیا تھا۔ اس کی فوج کی تربیت کے لئے فوجی افسر بھی انگریزوں نے فراہم کئے تھے۔ ایسے حالات میں سندھیا کی طاقت بڑھی اور اس کی بالادستی کو تسلیم کیا جانے لگا۔ انگریزوں نے بھی اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔

اب رہ گئی بیگم سمرو تو وہ شروع ہی سے انگریزوں کو اپنا دوست تصور کرتی رہی۔ انوپ شہر کی سرحدی چوکی پر انگریزوں نے اپنے جس فوجی افسر کو تعینات کر رکھا تھا اسے سکھوں نے قیدی بنا لیا۔ انگریزوں نے بیگم سے التجا کی کہ کسی طرح ان کے افسر کو رہائی دلوائیں۔ بیگم نے کمال مہارت سے پندرہ ہزار روپے زر خلاصی دے کر افسر کو آزاد کرا لیا اور اسے اپنے محل میں بڑی عزت دی۔ برطانوی حکومت نے بیگم کے اس رویے کی بڑی تعریف کی۔ اسے پندرہ ہزار روپئے ادا کئے اور

توصیفی خط لکھا۔ بیگم کو خوب یاد تھا کہ اس کے فرار کے وقت انگریزوں نے اس کے لئے اپنے علاقے کے دروازے کھول دیئے تھے۔ اس دوران گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ لارڈ ویلز لے آئے۔ وہ دو باتیں طے کر کے آئے تھے۔ ایک تو یہ کہ برطانوی حکومت کو اقتدار کی چوٹی تک پہنچائیں گے۔ صاف لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنی سرحدیں آگے تک پھیلائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اپنے ہندوستان سے فرانس والوں کو نکال باہر کریں گے۔ اس کے بعد گورنر صاحب کا جس علاقے پر بس چلا اسے اپنی عمل داری میں شامل کرنے لگے۔ کیا راجا، کیا مہاراجا، کیا نواب اور کیا وزیر، سب پر قبضہ ہونے لگا۔ بیگم سمرو اپنے علاقے کو بچاتے ہوئے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اوپر سے غضب یہ ہوا کہ مرہٹے آپس میں لڑ پڑے۔ وہاں خود پیشوا، سندھیا، ان کی بائیاں یعنی بیگمات اور کولہا پور کا راجا، سب ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ دلّی کے دربار اور سردھنا کی جاگیر دونوں پر سندھیا کا سایہ تھا۔ بیگم دیکھ رہی تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے سینگوں میں سینگ الجھائیں گے۔ سندھیا کے فرنگی افسروں کو احساس تھا کہ بیگم کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف ہے۔ انھوں نے خفیہ کوشش

شروع کر دی کہ بیگم کی فوجوں کو بھڑکا کر خاتون کے اقتدار کا خاتمہ کر یں۔ بیگم جانتی تھی کہ اگر وہ مرہٹوں کی طرف دار رہی تو دونوں میں کوئی بھی جیتے، اسے برابر کا نقصان پہنچے گا۔ اور اگر انگریزوں کی جیت ہوتی ہے تو پھر اس کا نقصان نہیں، نفع ہی نفع ہے۔ اور امکان یہی تھا۔ بیگم نے اپنی حاکمیت بچانے کے لئے انگریزوں سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی، وہ بھی چوری چھپے۔ اس نے انگریز حکمرانوں کو خط لکھا (4 اگست 1802ء) اور کہا کہ اگر میری حفاظت کی جائے تو میں اپنا علاقہ اور اپنی فوج آپ کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ولایتی حکام بڑے خوش ہوئے۔

آخر وہی ہوا۔ انگریز اور مرہٹے الجھ پڑے۔ بیگم سمرو کی پیشکش انگریزوں کو یاد تھی۔ انہوں نے بیگم سے کہا کہ اپنے فوجی دستے، جو اُس وقت مرہٹوں کی کمان میں تھے، انگریزوں کی کمان میں دے دے یا کم سے کم انہیں واپس بلا کر غیر جانبدار رہنے کا حکم دے۔

اس کے بعد لڑائی ہوئی اور سندھیا کی فوج بری طرح ہاری۔ اگرچہ بیگم کی پانچ بٹالین فوج اور پندرہ توپیں سندھیا کے ساتھ رہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ میدان جنگ سے صحیح سلامت لوٹ آئیں اور

انہوں نے سندھیا کا کیمپ بھی چھوڑ دیا۔ بیگم نے حکیم محمد جعفر کو اپنا نمائندہ بنا کر انگریز کمانڈر لارڈ لیک کے پاس بھیجا جن کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کے تحت بیگم نے برطانیہ سے اپنی وابستگی کا اعلان کیا اور انگریزوں نے، جو اس وقت تک دلّی اور اس کے نواح پر قبضہ کر چکے تھے، بیگم کو حکومت برطانیہ کی جاگیردار قرار دے دیا۔ مگر انگریزوں کا ذہن کسی اور طرح کام کر رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا مالدار اور دولت پیدا کرنے والا علاقہ حکومت کو مل جائے تو کیا برا ہے۔ علاقے پر بیگم کی حکمرانی مستحکم تھی، اسے وہاں سے اکھاڑنا آسان نہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ بیگم گنگا اور جمنا کے بیچ کا علاقہ چھوڑ دے اور اس کے بدلے جمنا پار کا علاقہ لے لے جس کا اسے خود مختار حاکم مانا جائے گا۔ بیگم جھٹ مان گئی۔ اسے خیال ہوا کہ اس کا رتبہ اونچا ہو جائے گا اور بڑے اختیارات مل جائیں گے۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ دلّی جا کر کرنل آکٹرلونی سے مل کر معاملات طے کرے۔ یہ وہی آکٹرلونی تھے، فوجیوں نے جن کا نام ''اختر لونی'' کر دیا تھا۔ بیگم دلّی گئی اور لارڈ ویلزلے کو خط لکھا کہ سردھنا کے معاملات نمٹانے کے لئے کمشنر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ میرے اور کمشنروں

کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو کیا ہوگا۔ اس علاقے میں بھاری رقمیں خرچ کر کے میں نے محل بنوائے ہیں، اپنی قیام گاہ تعمیر کی ہے اور اپنے فوجیوں کے مکان بنوائے ہیں۔ اب اگرچہ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ علاقہ نہ چھوڑو مگر میں یہ ساری املاک ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ رہی ہوں۔ میرے محلات کے بدلے مجھے جمنا پار جاگیر دے دی جائے۔ امید ہے وہ علاقہ اس طرح آراستہ ہوگا کہ اس کا بندوبست کرنے میں مشکل نہ ہوگی۔

اس کے جواب میں لارڈ ویلزلے نے جو خط لکھا وہ سفارت کاری کا نمونہ تھا۔ لکھا تو بہت کچھ تھا مگر مطلب اس کا یہ تھا کہ جلدی کرو اور علاقہ خالی کرو اور اپنی فوج کو تیار رکھو کہ جب ضرورت پڑے وہ حکومت برطانیہ کی مدد کرے گی۔

اس پر بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کتنے ہی وعدے ہوتے اور پھر ٹوٹتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ سردھنا خالی کرتے ہی اسے دوسرا علاقہ مل جائے گا لیکن سرکاری کارروائی سے یوں لگا کہ انگریزوں کو اس کا علاقہ لینے کی جلدی ہے۔ اس نے کرنل اختر لونی کو لکھا کہ میں نے لاکھوں روپے خرچ کر کے جو املاک بنائی ہے، آپ

چاہتے ہیں کھڑے کھڑے آپ کے عاملوں کے حوالے کر دی جائے۔ میں اور میرا کنبہ جا کر کہاں رہے گا۔ میرے علاقے میں تقریباً ایک ہزار بے گھر، معذور اور نابینا لوگ رہتے ہیں، وہ کہاں جائیں گے؟ میں بھی تیس سال سے اس علاقے کی مالک رہی ہوں۔ ہم سب کا کیا بنے گا؟ میرے بھائی کیا آپ آئیں گے اور میرا ہاتھ پکڑ کر علاقے سے باہر نکال کریں گے؟ دنیا اتنی تنگ نہیں ہے اور میں بھی بے دست و پا نہیں۔ میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھ رہوں گی اور تنہا رہ کر زندگی کے باقی دن گزار دوں گی۔

بیگم دلیر ہوگئی، انگریزوں میں بھگدڑ مچی۔ دلّی کے ناظم اختر لونی بیگم سے ملنے کے لئے لپکے اور اسے قائل کیا کہ حکومت برطانیہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اسے کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ آخر یہ سمجھوتا ہوا کہ دوسرے علاقے حکومت برطانیہ کے حوالے کرنے ہوں گے البتہ سردھنا کا پرگنہ بیگم ہی کے پاس رہے گا۔

اس دوران لارڈ ویلزلے واپس لندن بلا لئے گئے اور لارڈ کارنوالس دوسری مرتبہ گورنر جنرل بن کر آئے اور اپنے ساتھ مصالحت کی پالیسی لے کر آئے۔ لارڈ لیک پوری صورتحال سے

واقف تھے۔ اس پالیسی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا کہ بیگم سے بنا کر رکھنا چاہیئے تاکہ اسے حکومت پر اعتماد رہے۔ اس کے لئے بہتر ہوگا کہ بیگم کو یقین دلایا جائے کہ دوآب میں جو جاگیر بیگم کی ہے وہ زندگی بھر اسی کی رہے گی اور اس کے ساتھ کوئی نئی شرط وابستہ نہیں ہوگی۔ اس پر لارڈ کارنوالس نے 16 اگست 1805ء کو وہ خط لکھا جس میں بیگم کو سردھنا کی ملکیت برقرار رکھنے کا حکم درج تھا۔ اس نے لکھا کہ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ آپ کی جاگیر جس حالت میں ہے، آپ ہی کے قبضے میں رہنے دی جائے اور آپ کے تمام حقوق اور تمام رعایتیں جو اَب تک حاصل ہیں وہ آپ کو آئندہ بھی حاصل رہیں۔

سول کمشنر کو بیگم کے پاس بھیجا گیا اور اسی مہینے اس کے ساتھ معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ معاہدہ یہ تھا کہ ’دوآب کے جو مقامات زیب النسا بیگم کی جائیداد تھے وہ پہلے کی طرح زندگی بھر ان ہی کی ملکیت رہیں گے۔ وہ ہمیشہ کمپنی کی وفادار رہیں گی اور ان کی فوج ہمیشہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت کے لئے تیار رہے گی۔‘

بس اس کے بعد اس کی آدھی فوج اس کے پاس رہی تا کہ اس کی حفاظت کرے اور لگان وصول کرے، باقی آدھی فوج انگریز حکومت کی خدمت میں رہے گی البتہ اس کے اخراجات بیگم کے ذمے ہوں گے۔
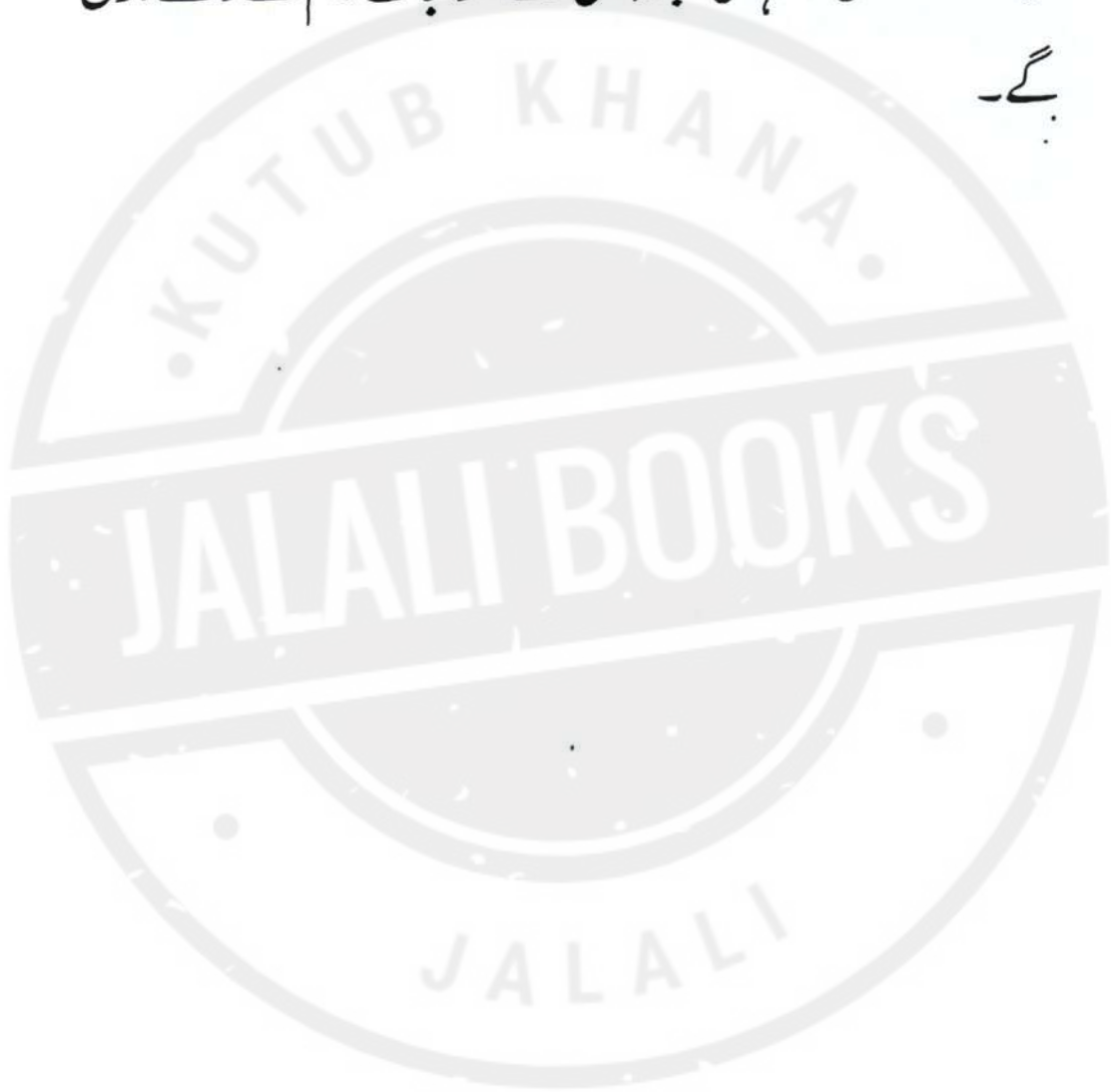
انگریزوں کے ساتھ اس معاہدے کے ساتھ ہی زیب النسا بیگم کی سیاسی زندگی اپنے انجام کو پہنچی۔ اس کے بعد اس کے اختیارات اس کی جاگیر تک محدود رہے جس کی وہ مکمل مالک تھی۔ اب اس نے ساری توجہ اپنے علاقے کی ترقی اور اپنی رعیت کی بھلائی پر لگا دی۔ اب اسے ان لوگوں کی فکر تھی جن کا گزارا اس کی مدد پر تھا اور وہ چل بسی تو ان کی خبر گیری کون کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جن لوگوں نے برے دنوں میں بھی اس کا ساتھ نبھایا اور جن کے گھر والے اس کی فوج میں شامل تھے اور اس کی خاطر جان سے گئے، ان سب کی دیکھ بھال کا کوئی بندوبست کر کے جانا چاہیے۔ اسے احساس تھا کہ اس کا وقت آخر دور نہیں اور اگر دیر ہوئی تو اس کے یہ ارادے دھرے کے دھرے نہ رہ جائیں۔ اس نے ایک درخواست لکھی جو گورنر جنرل لارڈ منٹو تک پہنچی۔ اس میں لکھا تھا کہ ایسا بندوبست کیا جائے کہ اس کے بعد اس کے بعد لواحقین کو ساڑھے سات ہزار روپئے ماہانہ پہنچتے رہیں۔ لارڈ صاحب نے اس کی درخواست خوشی خوشی مان لی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بیگم سمرو کو اپنے علاقے میں آباد مسیحی باشندوں کا خیال آیا۔ یہ مسلک تو وہ شروع ہی میں اختیار کر چکی تھی اور اس کی ترویج کی خواہشمند بھی تھی۔ اس وقت تک اس کے علاقے میں عبادت کے لئے کوئی گرجا گھر نہیں تھا۔ اس نے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے سردھنا میں شاندار چرچ تعمیر کرا لیا (1820ء) جو روم کے سینٹ پیٹرز کلیسا سے ملتا جلتا تھا۔ اس کام پر چار لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ دو سال بعد اسے عوام کے لئے کھول دیا گیا۔ یہ تو رومن کیتھولک چرچ تھا، بیگم نے میرٹھ شہر میں پروٹسٹنٹ مسلک کے لئے بھی ایک چھوٹا کلیسا بنوا دیا۔

مرنے سے پہلے اس نے اپنی املاک کو ٹھکانے لگانے کے انتظامات مکمل کر لئے۔ کس کو کیا اور کتنا ملے گا، یہ اختیار اس کے گود لئے ہوئے بیٹے ڈیوڈ آکٹرلونی ڈائس کو دیئے گئے۔ پھر بھی خاتون کو یہ خیال رہا کہ چونکہ وصیت نامہ انگریزی زبان میں ہے، کوئی کچھ سمجھے گا، کوئی اپنے مطلب نکالے گا، اس نے میرٹھ کے مجسٹریٹ اور علاقے میں موجود کچھ یورپی باشندوں کو طلب کیا اور اس فارسی دستاویز کی تصدیق کرائی جس میں طے تھا کہ اس کا جانشین کون ہوگا۔ خود بیگم کو بھی انگریزی نہیں آتی تھی اور وہ

صرف فارسی اور اردو زبانوں سے آشنا تھی۔ دستاویز میں بیگم کی ذاتی املاک اس کے گود میں لئے ہوئے بیٹے ڈیوڈ کے نام لکھ دی گئی۔ اس روز سے ڈیوڈ نے خود کو سمرو خاندان کا فرد قرار دے کر اپنے نام کے ساتھ لفظ 'سومبر' کا اضافہ کرلیا۔

یہ سارے کام نمٹا کر اور اپنی ریاست کی ذمہ داریاں بیٹے کو سونپ کر اس نے اپنا سارا دھیان مذہب اور خیرات کی طرف لگا دیا۔ کہتے ہیں کہ چھوٹی موٹی خیرات میں اس کا ہاتھ اتنا کھلا ہوا نہیں تھا لیکن بڑی بڑی رقمیں دینے میں اس کی فراخ دلی مثالی تھی۔ مثلاً اس نے پاپائے روم کو ڈیڑھ لاکھ روپے بھیج دیئے۔ اسی طرح لندن میں آرچ بشپ کنٹربری کے نام پچاس ہزار روپئے ارسال کئے گئے تاکہ اس کے منافع سے انگلستان کے مسیحی اداروں کو امدادی رقم ماہانہ ادا کی جائے۔ کلکتہ میں بیگم سمرو ٹرسٹ قائم کیا گیا جس میں ڈیڑھ لاکھ روپے جمع کرا دیئے گئے۔ اصل رقم محفوظ رکھنی تھی اور اس کے منافع سے ضرورت مندوں کو مدد فراہم کرنی تھی۔ خود سردھنا اور میرٹھ کے چرچ کے لئے بھی رقم علیحدہ رکھ دی گئی۔ گزیٹیئر میں لکھا ہے کہ اگرچہ اس کی دولت کا بڑا حصہ مسیحی مسلک کے لئے وقف تھا، اس نے ہندو اور مسلم اداروں کا

بھی دل کھول کر ہاتھ بٹایا۔ اس نے پل بنوائے اور عوام کے بھلے کی تعمیرات بھی کرائیں۔

اس کی لمبی اور بھرپور زندگی پر شام کے سائے تیزی سے ڈھل رہے تھے۔ اس کو بخار ہوا اور کئی دن بیمار رہی۔ اس پورے عرصے وہ آخر دم تک ہوشیار رہی۔ اس دوران چرچ کی دعائیہ تقریبات ہوئیں اور ایک صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب وہ خاموشی سے سدھار گئی۔ بدھ کا دن تھا، جنوری کی ستائیس تاریخ تھی اور سنہ تھا 1836ء۔

کہتے ہیں کہ شاکر شاہ نام کے ایک درویش نے اس کے مرنے کی تاریخ پہلے ہی بتا دی تھی۔ یہ درویش میرٹھ شہر میں رہتا تھا۔ ایک روز اس کے جی میں شدید خواہش ہوئی کہ سردھنا چلے۔ وہ گیا تو اسے پتہ چلا کہ بیگم سمرو شدید بیمار ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ خود بھی بہت بوڑھا تھا اور طبیعت بھی خراب تھی۔ اس سفر میں اس کی حالت بگڑ گئی اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا وقتِ آخر قریب ہے۔ اس نے بیگم کے پاس ایک ایلچی بھیجا اور اس سے کہلوایا۔ ”تم ٹھہرو، ہم چلے۔“ اس کے بعد درویش نے لوگوں سے کہا کہ بیگم سمرو ابھی پانچ سال اور جئے گی۔ یہ کہا اور گزر گیا۔ بیگم نے اس کی قبر پر مزار بنوایا۔

لوگ کہتے تھے کہ جس روز پانچ سال پورے ہوئے، وہی زیب النسا بیگم کی زندگی کا آخری روز تھا۔

اگلی صبح بیگم سمرو کا جنازہ اُسی شان سے اٹھا جیسے کسی بادشاہ یا فوج کے سربراہ کا جنازہ ہوتا ہے۔ ساتھ میں رشتے دار، باڈی گارڈ، بشپ، مجسٹریٹ اور فوج کے افسر۔ آگے آگے گھوڑ سوار دستے، چار ہاتھی جن پر بیٹھے ہوئے لوگ مجمع میں روٹیاں اور خیرات تقسیم کر رہے تھے۔ سردھنا کی گلیوں سے ہوتا ہوا یہ جلوس چرچ کے دروازے تک پہنچا۔ جہاں فوج نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ چرچ کے اندر آخری رسوم ادا کی گئی جس کے بعد میت لحد میں اتار دی گئی۔

اگلے روز اخبار میرٹھ آبزرور نے پورا منظر بیان کیا۔ اس نے لکھا کہ محل کی دیواروں کے باہر اور سڑکوں پر بے پناہ ہجوم تھا۔ پورے ماحول پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ مغموم تھے اور خاموش تھے۔ مقامی رسم کے مطابق تمام زیرِ کفالت افراد نے دن بھر کا روزہ رکھا، کسی گھر میں کھانا نہیں پکا، کسی نے آرام نہیں کیا۔ ہر گھر کا ہر فرد اشک بار تھا۔ اس طرح ایک ایسی شخصیت انجام کو پہنچی جسے ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں مقام حاصل رہا۔ بیگم سمرو کی شکل میں برطانوی

حکام کو ایسا پر خلوص حلیف حاصل رہا جو اِن کی مدد اور تعاون کے لئے ہر لمحہ آمادہ اور مستعد تھا۔

بیگم کی تدفین کے بعد بیگم کے رشتے دار اور میرٹھ کے مجسٹریٹ محل میں اکٹھا ہوئے، وہ وصیت نامہ پڑھا گیا جس میں اعلان کیا گیا کہ اس کی جاگیر حکومت برطانیہ کے حوالے کی جاتی ہے اور یہ کہ اب یہاں کمپنی کا قانون چلے گا۔ اس کے ساتھ ہی بیگم کے افسروں کے اختیارات ختم ہوتے ہیں۔ اس کی جائیداد براہ راست انگریز افسروں کی انتظامیہ کے تحت ہو گی اور صرف ان ہی کے احکام کی تعمیل کی جائے گی۔ یہ حکم نامہ جاگیر کے مختلف علاقوں میں بھی اسی روز جاری کر دیا گیا۔

اس کے بعد مجسٹریٹ نے بیگم کے رشتے داروں اور سرکردہ افسروں کی موجودگی میں اس کی ذاتی املاک کے بارے میں اس کا وصیت نامہ پڑھا جس میں تقریباً نصف کروڑ کی رقم گود لئے بیٹے، ڈائس سومبر کے حوالے کی گئی اور چھوٹے موٹے ترکے دوسروں کو سونپے گئے۔

جاگیر یہاں سے وہاں تک۔

بیگم سمرو کوئی مطلق العنان شہزادی نہیں تھی۔ اسے تخت دلّی کی

زمین جاگیر کے طور پر دی گئی تھی، اس شرط پر کہ وہ اپنی فوج رکھے جو بادشاہ وقت طلب کرے تو اس کے کام آئے۔ گنگا اور جمنا کے درمیان اس کی جاگیر مظفر نگر سے علی گڑھ تک پھیلی ہوئی تھی جس میں سردھنا، کرنال، بُڈھانا اور کتانہ جیسے کئی پرگنے شامل تھے۔ وہی کتانہ جہاں سے کبھی وہ ماں کا ہاتھ تھام کر گھر سے نکل گئی تھی۔ لیکن ان پرگنوں میں مرکزی حیثیت سردھنا ہی کو حاصل تھی۔ بیگم کی یہ جائیداد بے حد مالدار تھی، اس کی سرحدیں میرٹھ، شاملی، کاندھلا، باغپت، شاہدرہ اور دلّی کو چھوتی تھیں۔ اس کے علاوہ جمنا پار کا بھی کچھ علاقہ اس کے پاس تھا جسے وہ اپنا ''التمغہ'' قرار دیتی تھی، یعنی شاہی عطیہ وہ بھی تاحیات۔ صوبہ اکبرآباد یعنی آگرہ کا شاہ گنج باغ اور گاؤں بھوگی پورہ اس کے شوہر سمرو صاحب کو دیئے گئے تھے تاکہ وہ اپنا خرچ نکال سکیں۔ آگے چل کر یہ علاقہ بیگم کی ذاتی ملکیت تسلیم کیا گیا۔ شاہ گنج کا مقام آگرہ کے قلعے سے دو میل مغرب میں فتح پور سیکری جانے والی سڑک پر تھا جس سے ذرا آگے بیگم سمرو کا شاندار باغ تھا جو بغاوت ہند کے زمانے تک موجود تھا۔

بیگم کے انتقال کے ساتھ ہی اس کی جاگیر حکومت برطانیہ کی تحویل میں چلی گئی۔ اس کے جانشین ڈائس سومبر کی ایک دستاویز سے

پتہ چلتا ہے کہ گنگا اور جمنا کے درمیان کے علاقے سے سالانہ آٹھ لاکھ روپئے کی آمدنی تھی۔ چھ لاکھ دوآب سے اور باقی دوسرے پرگنوں سے۔

اس کی فوج پر سالانہ تقریباً چار لاکھ کا خرچ آتا تھا۔ شہری انتظامیہ پر اسّی ہزار اور گھر گرہستی پر بھی اتنا ہی خرچہ تھا، یعنی سب ملا کر چھ لاکھ سالانہ۔ اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے بعد نصف کروڑ روپئے سے زیادہ کی نقدی چھوڑی تھی۔ یہ رقم یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سارے علاقے پورے تیس برس تک تنہا اسی کی ملکیت رہے۔

وہ چونکہ بادشاہ دلّی کی جاگیردار تھی، شاہ کی مدد کے لئے اسے اپنے خرچ پر فوج رکھنی پڑی۔ اس کی آدھی فوج سردھنا میں اور باقی دلّی میں رکھنی پڑتی تھی جو بادشاہ کی خدمت کے لئے حاضر رہتی تھی۔ اس کے پاس بڑا اسلحہ خانہ تھا اور توپیں ڈھالنے کی فاؤنڈری سردھنا کے قریب ہی تھی۔ اس کی فوج بہت ہی منظّم اور پوری طرح تربیت یافتہ تھی۔ اس کی فوج کے اعلیٰ افسر یورپ کے مختلف ملکوں سے آئے تھے۔ اس کے انتقال کے وقت اس کی فوج کا سربراہ جنرل راگھالینی تھا اور گیارہ ولایتی افسر بھی متعین تھے جن میں ایک جان ٹامس تھا، مشہور و

معروف جارج ٹامس کا بیٹا۔

خود بیگم بڑی ہی جی دار لڑا کا تھی۔ بہت ذہانت سے فوج کی قیادت کرتی تھی۔ اس نے کئی جنگوں میں اپنی فوج کی کمان سنبھالی۔ مرہٹوں کا کمانڈر کرنل اسکنر کہا کرتا تھا کہ اس نے اس خوب صورت نوجوان لڑکی کو خود حملے کی قیادت کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھیانک تباہ کاری میں بڑی ہی نڈر ہو کر اور پوری حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ دکن کے جو لوگ بیگم سے واقف تھے کہا کرتے تھے کہ وہ ایسی چڑیل ہے کہ دشمن پر اپنی چادر پھینک دے تو دشمن تباہ ہو جاتا تھا۔ کہنے والے تو اور خدا جانے کیا کیا کہتے تھے۔ بیگم سمرو کے بارے میں یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا لیکن بیگم نے اسے بچپن ہی میں ہلاک کر دیا تھا کیونکہ، لوگوں کے بقول 'وہ شادی کرنے کے قابل نہیں تھا۔' Transgender ہو گا، نہ لڑکا اور نہ لڑکی۔ سردھنا میں ان کے خاندانی قبرستان میں بھی کوئی بچے کی قبر نظر نہیں آئی۔

بیگم سمرو کی کہانی ختم ہوئی مگر سردھنا کی داستان جاری ہے۔

ہوا یہ کہ انگریزوں کے لئے ہندوستان تو ملائم لقمہ ثابت ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ اسی طرح افغانستان میں بھی جڑیں پکڑ لیں گے تا کہ روس والے افغان علاقے میں نہ چلے آئیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو لے کر افغانستان پر چڑھائی کر دی (1843ء)۔ چوٹی کے انگریز افسروں کی مدد سے وہ اندر تک داخل ہو گئے لیکن واپسی یا پسپائی کے راستے کھلے چھوڑ دیئے۔ وہ افغانوں کی فطرت سے واقف نہ تھے۔ افغانوں کو جوں ہی موقع ملا، وہ انگریزوں کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور اسے گاجر مولی کی طرح کاٹا۔ جو بچ رہے وہ ہندوستان کی جانب بھاگے۔ بھاگنے والوں میں وہ افغان بھی شامل تھے، جنہوں نے انگریزوں کی مدد کی، ان کو پناہ دی یا فرار کے راستے بتائے۔ ان میں کابل کے قریب صوبہ پغمان کے سردار سید محمد شاہ پیش پیش تھے۔ شاہ شجاع جو افغانستان کے بادشاہ بن بیٹھے، ان کو بچانے میں سردار سید محمد شاہ نے بڑی سرگرمی دکھائی اور ان پر جان چھڑکی۔ اسی مناسبت سے

انہوں نے شاہ صاحب کو جاں فشاں خان کا خطاب دیا اور وہ آج تک اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ ہاں تو وہ بھی اپنے گیارہ بیٹوں ☆ اور کنبے کے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان آ گئے۔ زیادہ تر بیٹے 1857ء کی بغاوت میں کام آئے۔

کیسا عجب اتفاق ہے کہ جب جاں فشاں خان اور ان کے اہل و عیال کو بسانے کا مرحلہ آیا تو سردھنا میں بیگم سمرو کی حویلیاں خالی پڑی تھیں۔ ان سب کو نہ صرف یہ کہ سردھنا میں بسا دیا گیا بلکہ سردھنا کی پوری جاگیر نواب صاحب کے نام کر دی گئی جس کی بھاری آمدنی تھی۔ گرچہ نواب صاحب کی اولاد کے بہت سے افراد، پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے مگر ان کی اولادیں بڑھتی گئیں اور دنیا میں پھیلتی گئیں۔ یہی نہیں، کئی نے بڑی شہرت پائی اور اونچے مقام تک پہنچیں۔ ان میں ہندوستان کے اعلیٰ فوجی افسر ضمیر الدین شاہ شامل ہیں جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ انہوں

☆ سید لالا میر خان، امیر سید خان، سید محمد علی شاہ، سید فتح علی شاہ، سید محمد شاہ، سید علی شاہ، سید ابرار شاہ، سید شمس الدین خان، سید احمد شاہ، سید بہادر علی شاہ، سید سلیمان شاہ۔

نے بیگم سمرو کی حویلیوں کے کھنڈر گرا کر وہاں علاقے کے بچوں کے لئے جدید مدرسہ بنا دیا ہے اور یو پی کے اس علاقے میں تعلیم سے محروم بچوں کے لئے بڑا کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے چوٹی کے اداکار نصیر الدین شاہ اور پاکستان کے اداکار کمال کے نام آتے ہیں۔ یہ سب اپنا شجرہ نسب حضرت علیؓ سے جوڑتے ہیں۔ ان لوگوں کا تصوف سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ ادب اور تصنیف کے شعبے میں بھی اس خاندان کے افراد کے نام آتے ہیں۔ (سردھنا اردو ادب کے میدان میں پیچھے رہا اور اس شہر سے وابستہ ناول نگار صادق حسین سردھنوی کے علاوہ کوئی ادیب نظر نہیں آتا۔)

یہاں میں اپنا بستہ بند کرتا ہوں۔ جاں فشاں خان کی داستان ابھی جاری ہے۔ ان کے خاندان کے کئی افراد نے مجھے بتایا کہ وہ سردھنا کی تاریخ لکھ رہے ہیں مگر مجھے اب تک تو کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ یہ لمبا چوڑا عمل ہے جسے مکمل کرنے کی توانائی میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی اور تجسس کا مارا اٹھے اور دنیا میں پھیلی ہوئی اس سادات کی داستان کہہ سنائے۔ میں نے دو مرتبہ سردھنا دورہ کیا۔ مقامی احباب نے میرے لئے اپنے در کھول دیئے۔ ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں خاص طور پر مظہر امام شاہ صاحب اور ان کی اہل خانہ کی نوازشوں کا احسان مند ہوں۔

سردھنا ایک اور یادگار تصویر جس میں بیگم کے ساتھ کوئی برطانوی افسر نظر آرہا ہے

بیگم سمرو اور ان کے خدمت گاروں کی یادگار تصویر

بیگم سمرو اور ان کے خدمت گاروں کی یادگار تصویر
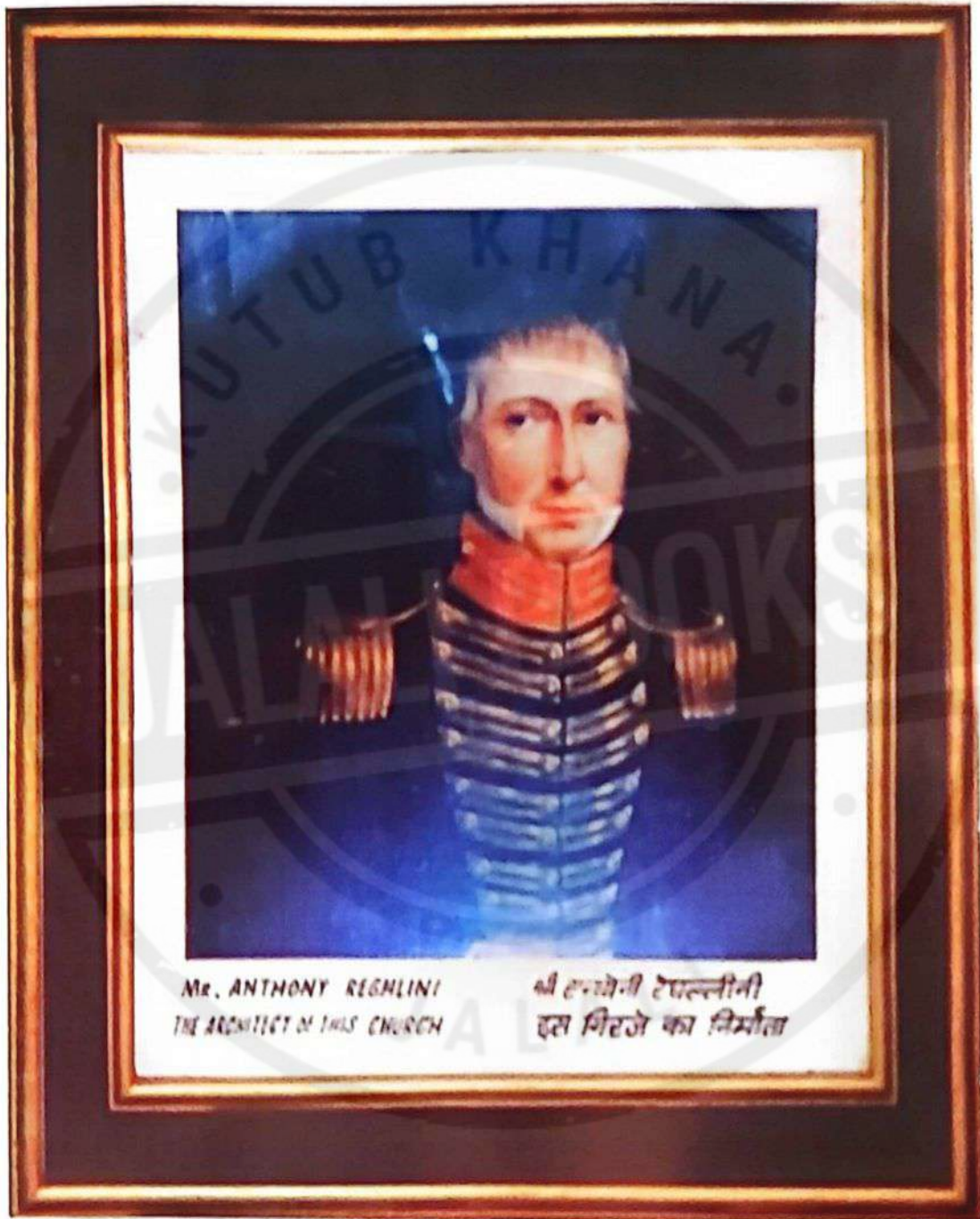
سردھنا بیگم سمرو کے چرچ کے معمار جن کی تصویر وہاں آویزاں ہے
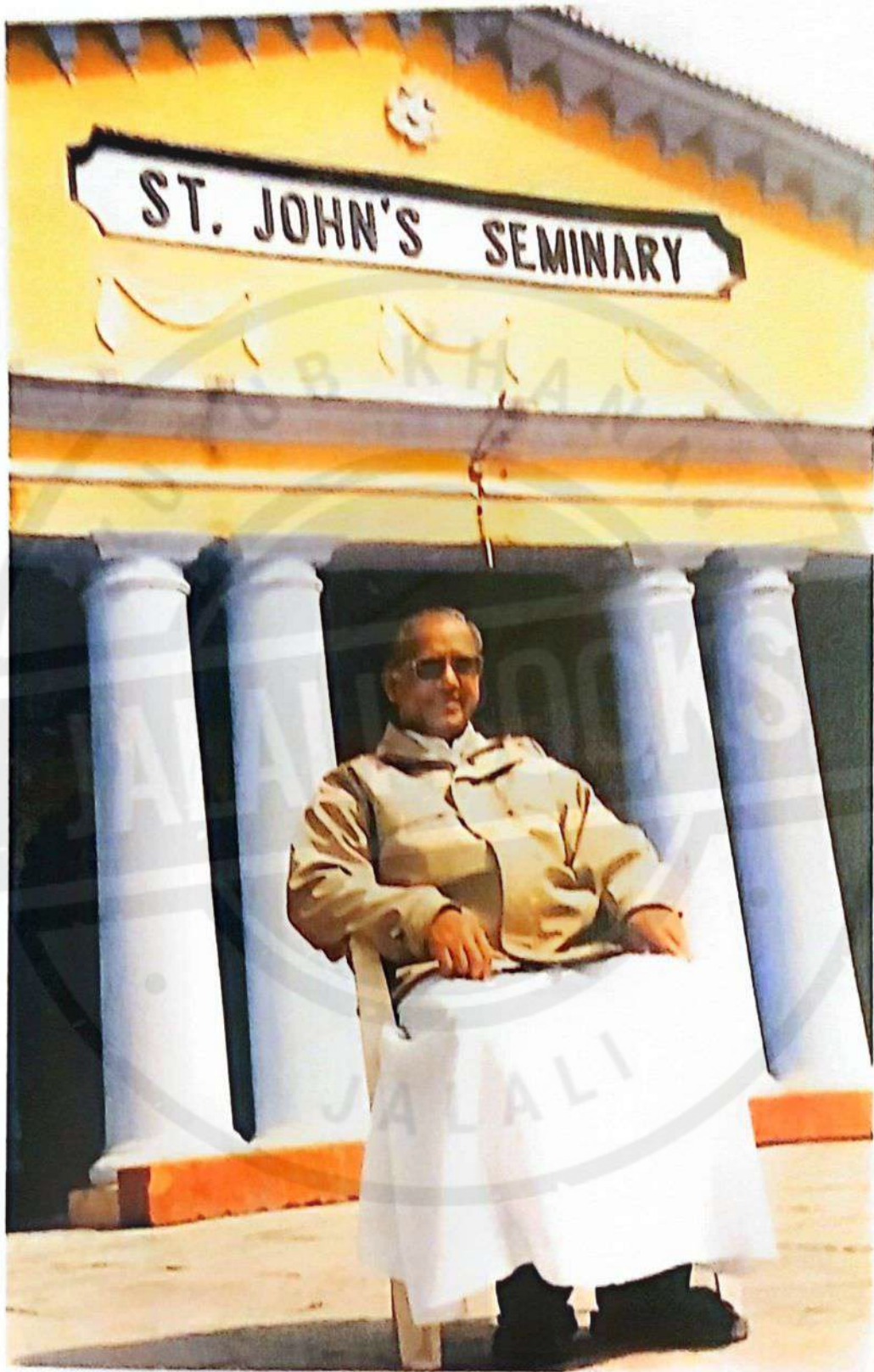
سردھنا بیگم سمرو کے چرچ کے پادری جو وہاں آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں
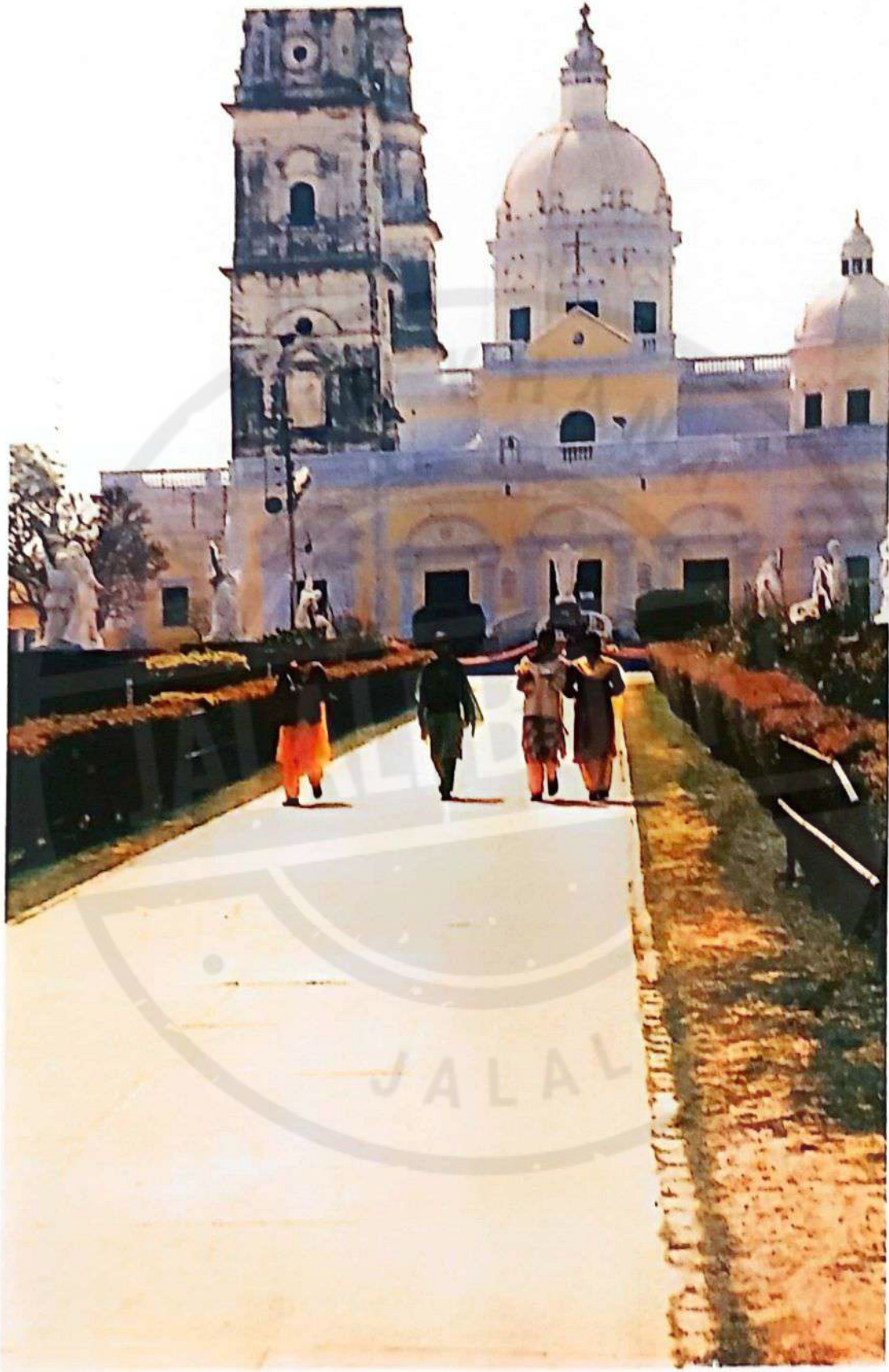
سردھنا: بیگم سمرو کا چرچ جسے دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں

سردھنا: بیگم کے چرچ کے سامنے یسوع مسیح کا مجسمہ

سردھنا: بیگم سمرو کی حویلیاں کھنڈر ہوگئیں

سردھنا بیگم سمرو کے چرچ کا بیرونی منظر

سردھنا چرچ کا اندرونی منظر
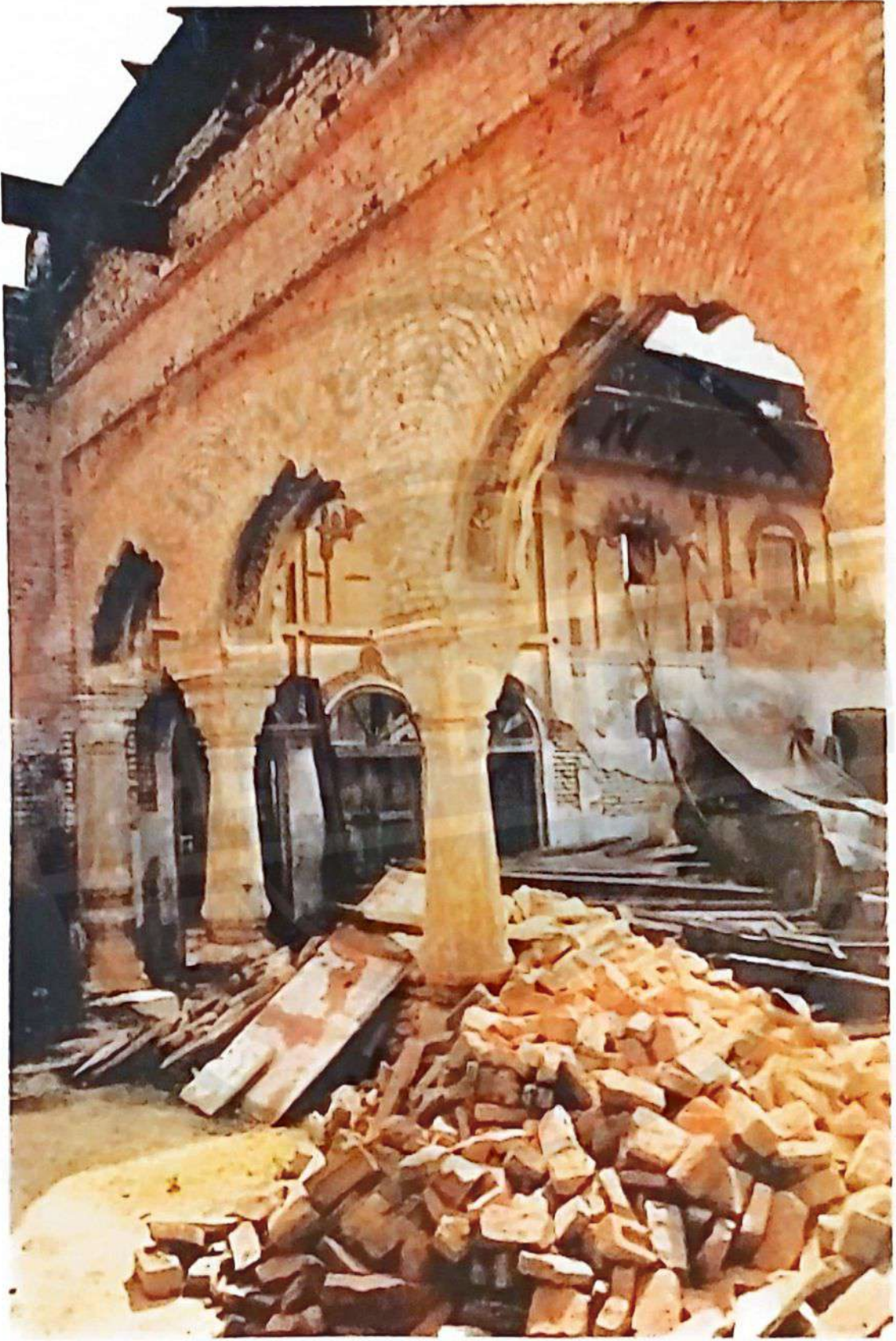
سردھنا: جہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں / وہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں

سردھنا: بیگم سمرو کی حویلی کے کھنڈر میں لڑکیوں نے طاق میں گڑیا کے گھر بنائے ہیں

سردھنا: حویلیوں میں نوعمر لڑکیوں کے لئے بنائے گئے طاق جنھیں ہم گڑیوں کے
گھروندے کہہ سکتے ہیں
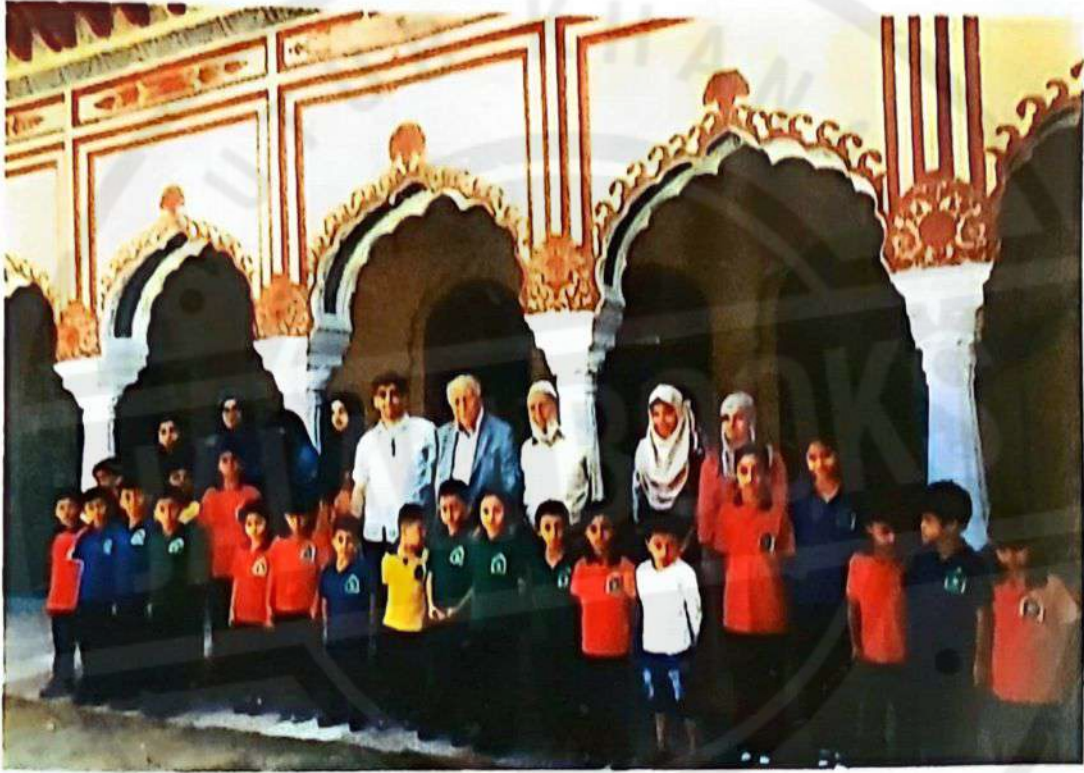
نیا سردھنا جہاں حویلیوں کے کھنڈر تھے وہاں اب علاقے کے بچوں کے لیے مدرسہ تعمیر ہو گیا ہے
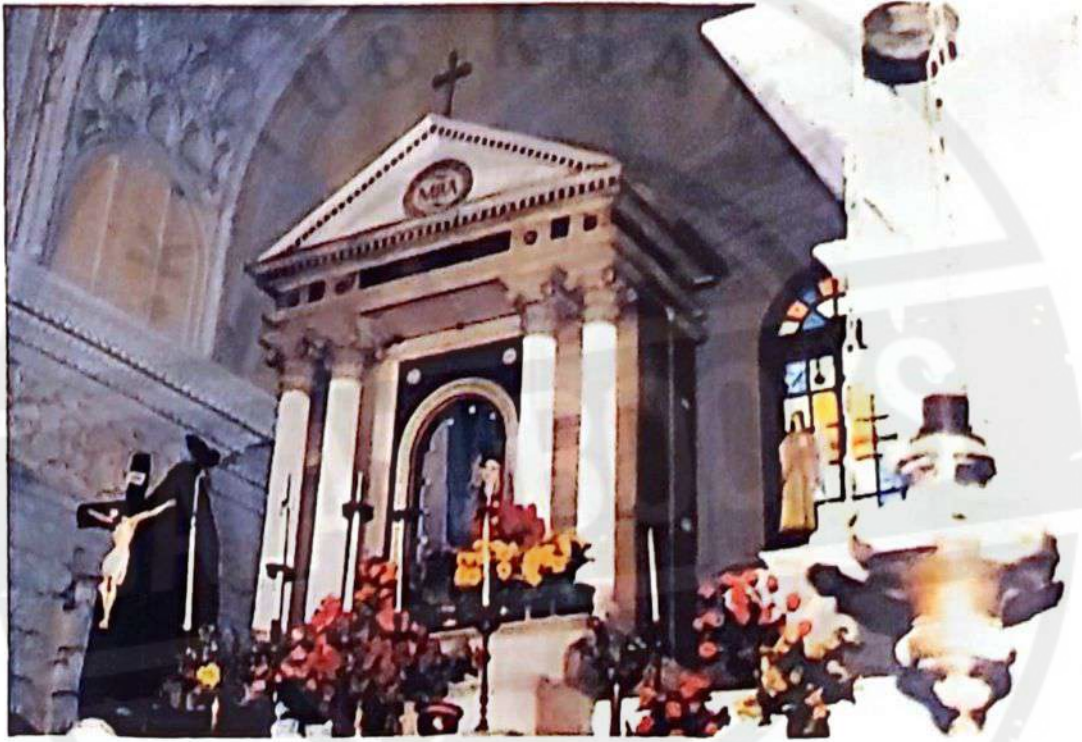
سردھنا: بیگم سمرو کے چرچ کا اندرونی منظر

نیا سردھنا جہاں حویلیوں کے کھنڈر تھے وہاں اب علاقے کے بچوں کے لیے مدرسہ بن گیا ہے
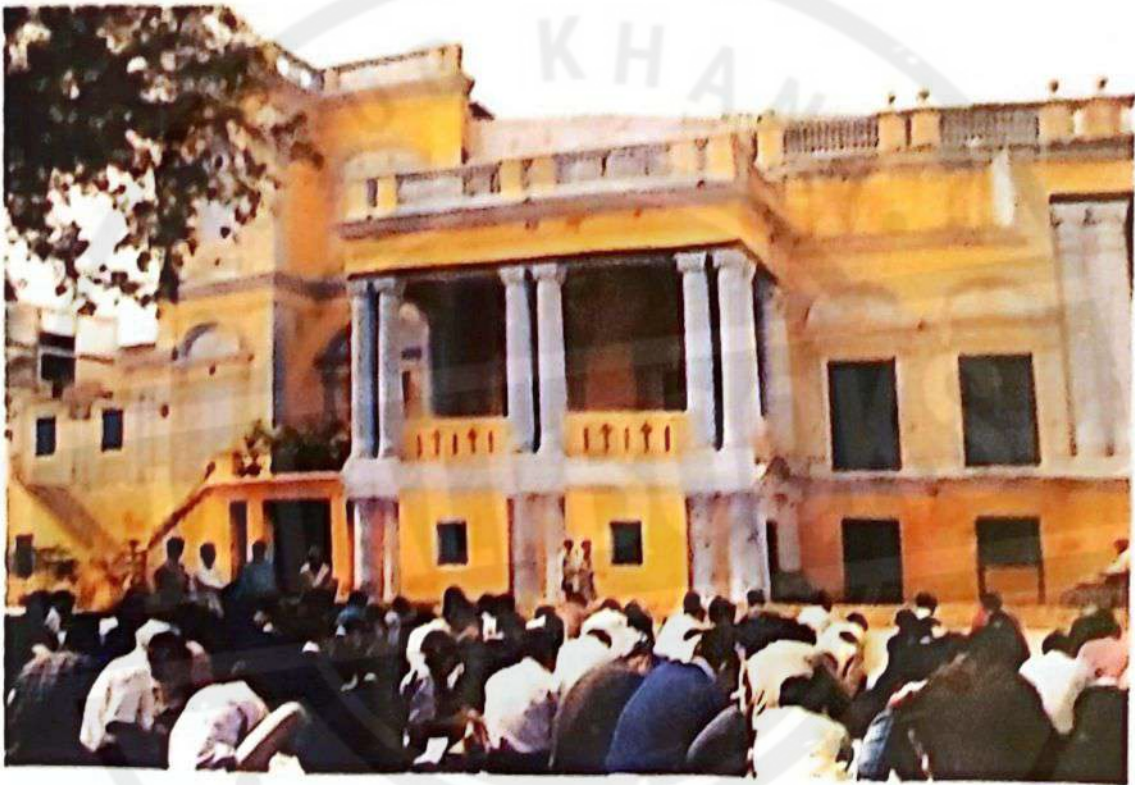
سردھنا: بیگم سمرو کی یورپی طرز کی عمارت میں کالج بن گیا ہے۔
سردی کا موسم ہے بچے باہر دھوپ میں بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں

سردھنا: بیگم سمرو کی حویلی کے کھنڈر اپنی داستان خود بیان کر رہے ہیں

سردھنا بیگم سمرو کے چرچ کا بیرونی منظر

سردھنا بیگم سمرو کے دور کی یورپی طرز کی ایک عمارت

سردھنا آخر عمر بیگم سمرو یورپی طرز کی عمارتیں بنوانے لگی تھیں جن میں اب تعلیمی ادارے کھل گئے ہیں
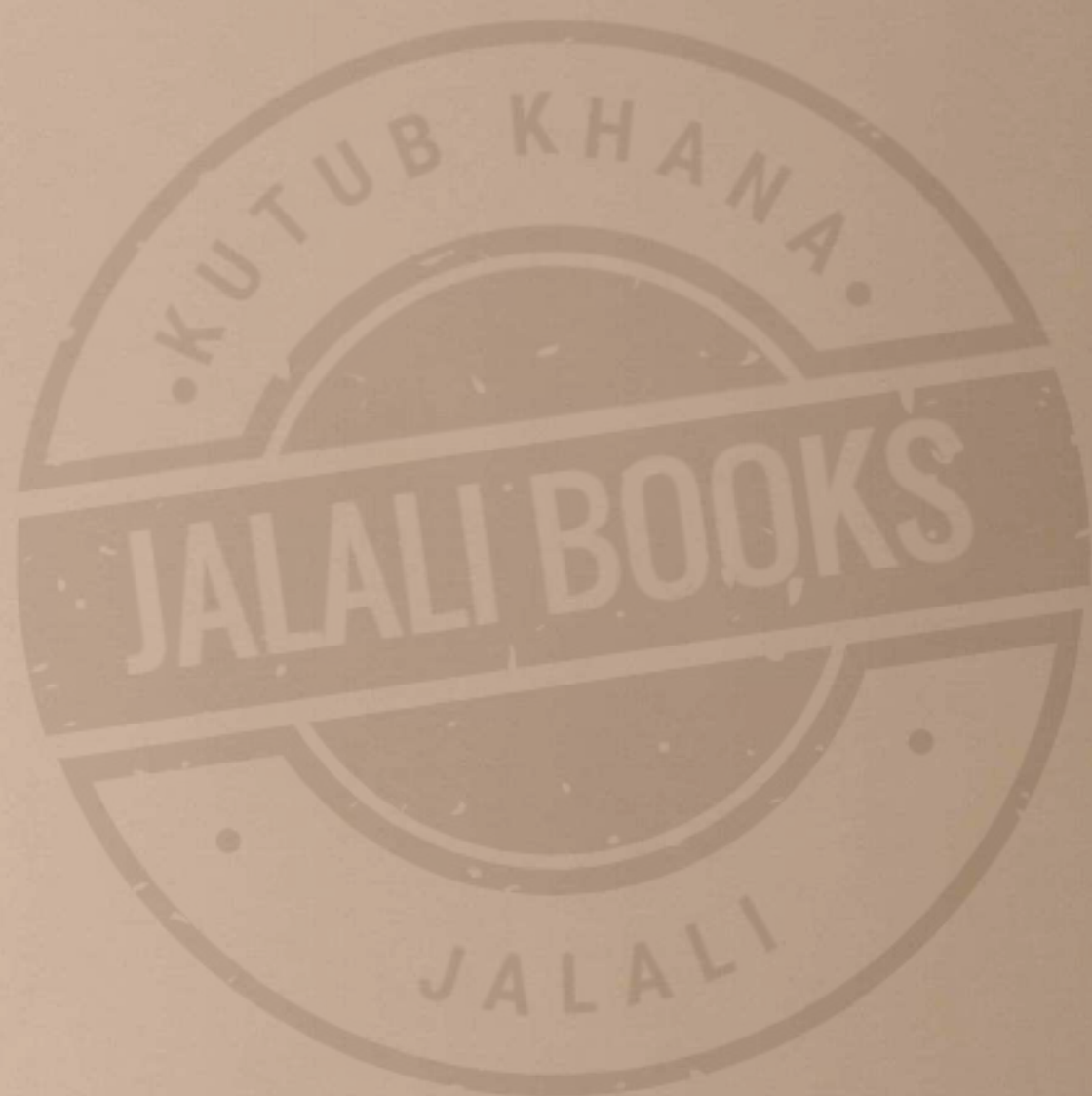
وہ کون تھی؟
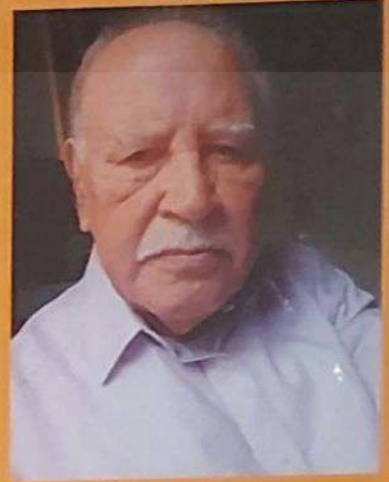
جب بھی میں نے احباب کو بتایا کہ بیگم سمرو کی داستانِ حیات لکھ رہا ہوں، ہر ایک نے پوچھا: وہ کون تھی؟ آج جب میں نے یہ داستان مکمل کر کے اور تھک کر کچھ نڈھال ہو کر قلم ایک طرف ڈالا، وجود کے اندر سے آواز آئی: وہ کون تھی؟ میں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر میری ایک نہ چلی۔ تھک ہار کر بیٹھ رہا۔

یہ داستان ہندوستان کے اردو بولنے والے ضلع میرٹھ کی ایک گلی سے شروع ہوتی ہے جہاں ۱۷۵۳ء کے آس پاس ایک متوسط گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت لڑکی کا نام فرزانہ رکھا گیا۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ ایک روز دلّی کے تخت پر بیٹھا مغل بادشاہ اسے زیب النسا کا خطاب عطا کرے گا۔ وقت کروٹ پر کروٹ بدلے گا۔ لڑکی ایک یورپی فوجی سمرو صاحب کے حرم میں داخل ہو جائے گی۔ اور جب ۱۸۳۶ء میں پچاسی برس کی عمر پا کر وہ اپنے انجام کو پہنچے گی، وہ سردھنا جیسی بڑی اور مال دار جاگیر کی حکمراں ہوگی۔ بے حد تربیت یافتہ یورپی طرز کی فوج کی کمانڈر ہوگی۔ ڈولی میں بیٹھ کر مخالف فوج سے جنگ کرے گی اور مردوں کی طرح صافہ باندھ کر دربار لگائے گی۔ کون جانتا تھا کہ اس کی تجوریوں سے دولت ابلی پڑتی ہوگی۔ کچھ یہی حال اس کی زندگی کی کہانیوں کا ہوگا۔ وہ سب کی سب یہاں سپردِ قلم کر دی گئی ہیں۔

رضا علی عابدی

۱۰۔ اگست ۲۰۲۳ء لندن

Rs. 600.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3535-9
ISBN-13: 978-969-35-3535-8

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور